ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

اکتوبر ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	شیطانی ترغیبات	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر ۳
۳۔	پیام سیرت	مستقبل کی منصوبہ بندی۔سیرت کا ایک اہم پہلو	محمد فرید حبیب ندوی
۴۔	تاریخ کے جھروکوں سے	دارالمصنفین کے چند اساطین	عمیر الصدیق ندوی دریابادی ۱۵
۵۔	صدائے بازگشت	رسول کا پیار چاہیے یا مال و دولت کا انبار؟	محمد فرید حبیب ندوی ۱۷
۶۔	اسلامی تعلیمات	اچھے اور برے ناموں کے اثرات	کفیل احمد ندوی ۲۱
۷۔	فقہی مباحث	غذا کے احکام اور علاج کی شرعی مصلحتیں	تحریر: عبدالباسط ندوی، مترجم: ڈاکٹر اشرف علی ندوی ۲۴
۸۔	تجزیہ	ایک بصیرت افروز تجزیہ	محمد قمر الزماں ندوی ۳۴
۹۔	پیغام کربلا	آج حسینی کردار کی پھر ضرورت ہے	مولانا محمد مجیب الدین قاسمی (ایم۔اے) ۳۷
۱۰۔	// //	محرم الحرام کا پیغام۔ہم مسلمانوں کے نام	محمد حماد کریمی ندوی ۴۲
۱۱۔	رہنما خطوط	رہنمائے طلبہ۔کیسے چنیں اپنا مقصد	فیروز عالم ندوی ۴۵
۱۲۔	فکر فردا	صہیونیت، ہندوتوا اور ہندوستان	احمد جاوید ۴۸
۱۳۔	ادراک حقیقت	جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے	محمد الیاس ندوی بھٹکلی ۵۴
۱۴۔	شخصیات	پروفیسر رفیع احمد علوی مرحومؒ	عبید اقبال عاصم ۵۷
۱۵۔	قضیۂ فلسطین	رہے خموش تو ظالم کی پیروی ہوگی	محمد سراج الہدی ندوی ازہری ۶۱
۱۶۔	آخری صفحہ	یہ بیرسٹر مسلمان ہیں یا منافق؟	م۔ق۔ن۔ ۶۴
۱۷۔	غزل	اربابِ محبت سے یہ کہو، شکوے نہ کریں کچھ کام کریں	ماہر القادری

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی:

گزشتہ دنوں متعدد خبروں نے دل دہلا دیا، لہو گرما دیا اور کفِ افسوس ملنے پر مجبور کر دیا، وہ عالم عربی بالخصوص وہ جزیرۃ العرب جس کو قدرت باری نے اسلام کے گہوارے کے طور پر پسند کیا تھا اور دنیائے انسانیت کی باگ ڈور جس کے ہاتھ میں دی تھی آج وہ کفر وشرک کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے، وہاں کے امراء وحکام فلسطین وشام وعراق کے مظلوموں کو بھلا کر جشن منانے میں مگن ہیں، انہیں نہ عالم اسلام کا چاک گریباں نظر آتا ہے اور نہ لہولہان دامن پر ان کی نظر پڑتی ہے، نہ انہیں پناہ گزینی کے نام پر تبدیلی مذہب کی خبریں ستاتی ہیں، اور نہ عورتوں، بچوں کی دلخراش چیخیں، جس جزیزۃ العرب کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ ''یہاں دو دین نہیں رہ سکتے'' اور ''یہود ونصاریٰ اور مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو'' آج اس جزیرۃ العرب کے شاہان وہاں مندر و چرچ تعمیر کر رہے ہیں، جن کا کام مسجد اقصی کی بازیابی تھا وہ اب محمد عربی ﷺ کی سرزمین پر کفر وشرک کے اڈے تعمیر کر رہے ہیں، نہ جانے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه کا مطلب کیا سمجھا جاتا ہے اور اس کی اجازت کہاں سے مل جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب کے کسی ٹکڑے پر غیر اللہ کی عبادت کے لئے عبادت گاہیں تعمیر کی جائیں، بہت واضح ارشاد ہے، ان الدین عند الله الاسلام (آل عمران:۱۹) (ترجمہ: نظامِ حیات، اور اطاعت کے طریقۂ کار کا نام اسلام ہے) اب اس فرمان کے بعد دنیا کا کوئی مذہب سوائے کفر وگمراہی کے کچھ نہیں قرار پاتا کہ خالق کائنات نے اسلام کو آخری اور ابدی اور انسانی وآفاقی مذہب کے طور پر دنیا میں برپا کیا ہے، ظاہر ہے کہ دیگر مذاہب میں عبادت کی جو جگہیں بھی ہیں وہ کفر وشرک کے اڈے ہونے کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ عبادت صرف اللہ کی ہوگی اور وہ بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوگی، باقی جو بھی عبادت یا مکان عبادت ہے وہ کفر شرک کا علامت ہے، کسی اسلامی ریاست میں کوئی غیر اسلامی عبادت گاہ تعمیر کرنا تو دور اس کو بے کار میں باقی رکھنا اور اس سے محبت کرنا یا تو جہالت ہے یا نفاق کی علامت ہے، اما ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص معالم شرک کو باقی رکھنے کا مشورہ دے وہ یا تو سیاست شرعی سے ناواقف ہے یا کھلا ہوا منافق ہے۔

وہ عرب جنہیں توحید خالص کا جام پلایا گیا تھا، جنہیں محمد رسول اللہ کی ابدی رسالت کا مخاطب اول بنایا گیا تھا، جن کے آباء اجداد نے مئے توحید سے مخمور ہو کر دنیا کے کونے کونے تک وحدانیت کی روشنی پہنچائی تھی، آج ان کو کیا ہو گیا کہ وہ کہیں چرچ بنا رہے ہیں تو کہیں مندر کی تعمیر کے لئے زمین کا عطیہ دے رہے ہیں، وہ بھی ایسے شخص کو جس کی گردن پر ہزاروں مسلمانوں کا خون

ہے اور جس کے ساتھیوں نے ہندوستان میں متعدد مساجد کو زمیں بوس کیا ہے، علمائے امت کی نظر میں آخر اس ''مستحسن اقدام'' کی توجیہ کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا توجیہ کر سکتے ہیں جو خانۂ خدا میں اللہ اکبر کی صداؤں کے بجائے ''مودی مودی'' کے نعروں کی گونج پر بھی خاموش رہے، کفر کی شناعت کا دل میں ہونا، اس کو حرام سمجھنا، اس کی عبادت گاہوں کی تعمیر کو حرام سمجھنا، غیر اسلامی شعار کو حرام سمجھنا ایمان کا بنیادی تقاضہ ہے، پھر جزیرۃ العرب میں دو قبلوں کو وجود میں لانا، وہاں کفر و شرک کے اڈے قائم کرنا، وہاں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو بسانا حضور پاک علیہ السلام کے فرمان کی صریح مخالفت ہے، مخالفت ہی نہیں بدترین درجہ کا جرم اور اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والا فعل ہے۔

آخر یہ کمزوری کیوں کر آئی، عقائد سے لے کر اعمال تک، حکومت سے لے کر تجارت و معیشت تک یہ شاہان عرب غلام کیوں کر بن گئے، ذہنی فکری اور اب تو مذہبی طور پر دیوالیہ پن کا شکار کیوں ہو گئے، ان پر اپنی ہی ماؤں بہنوں کی لٹتی ہوئی عصمتوں کو دیکھ کر رعشہ کیوں نہیں طاری ہوتا، ان ہی کی قوم کے افراد باہم دست و گریباں کیسے ہوئے، انہیں اسلامی نظام سے خطرہ کیوں محسوس ہونے لگا، اسلام کے نام سے نفرت کیوں ہونے لگی، یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے دوستی پر قرآن کی صریح نکیروں کے باوجود امریکہ میں متعین امارات کے سفیر کا یہ بیان کیوں آیا کہ اسرائیل ہمارا بہترین دوست ہے، اپنے استحکام کے لئے اسرائیل سے دوستی انتہائی ضروری ہے، آخر اسلام پسندوں کی سزائے موت پر یہ رقص کیوں کرنے لگے، اس کے بالمقابل یہودیوں کے مفاد میں کیسے کام کرنے لگے، مسجد اقصیٰ کے سایہ میں یہودیوں کے مظالم سہتی عورتیں اور ان کے ظلم کا شکار ہوتے بچے ان میں احساس کیوں نہیں پیدا کرتے، ہزاروں مہاجرین جو یورپی ممالک پہنچ کر اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہیں انہیں یہاں جگہ کیوں نہیں ملتی، شام کے کافر کی حمایت یہ کیوں کرتے ہیں، وہاں سے نکل کر غرق ہو جانے والے لوگ ان کے دلوں کو کیوں نہیں جھنجھوڑتے، چھوٹے چھوٹے معصوموں کی شہادت بھی ان کو سیلفی (Selfie) لینے میں مگن رہنے سے کیوں نہیں باز رکھتی، عالم اسلام کے چور ہوتے ہوئے جسم کے باوجود ان کی عیش کوشیوں میں کمی کیوں نہیں آتی، آخر یہ اسلام کے رکھوالے اسلام کے دشمن کیسے بنتے جا رہے ہیں جن کی ناعاقبت اندیشیوں سے مصر پھر بہت دنوں تک تباہی کی دلدل میں پھنس گیا اور اب ترکی ان سب کے نشانے پر ہے۔

یہ اور ان جیسے بہت سے سوالات کا جواب قرآن کریم میں موجود ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک طویل مدت گزر گئی جس میں ہم نے اسلام کی جزئیات کو سمجھنے میں اپنا زور صرف کیا اور اس کے کسی ایک پہلو پر عمل کرنے کو ہی معراج سمجھتے رہے، کسی نے اس کے کسی فرض کو اپنا شعار بنالیا اور کوئی کسی سنت کو لے کر اپنے کو داعی ثابت کرتا رہا، مکمل اسلام کی بات کرنے میں بہر حال غفلت برتی گئی، پٹرول کی برآمد کے بعد تو حضرات علماء جزیرۃ العرب کی ہر برائی پر پردہ ڈالنے لگے، اور ایک بڑی تعداد **ویشترون بایاته ثمنا قلیلا** پر آمادہ ہو گئی، وہ وہاں نظر آنے والے اسلامی مظاہر کو ہی کافی سمجھنے لگے اور ایران کا ایسا ''خوف'' کھڑا کیا گیا کہ اس کے نتیجہ میں جزیرۃ العرب کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ قوموں کے احوال، منافقین کی حرکتیں اور معاندین کے انجام اسی لیے بیان فرمایا

ہے کہ امت مسلمہ ان سے بچتے ہوئے اپنے مستقبل کا سفر طے کرے، لیکن افسوس کہ پیشگی اطلاعات بلکہ اس قدر واضح پیش بندیوں کے باوجود آج تک یہ مسئلہ حل نہ ہوا کہ ہم حکام کو دعوت دیں یا داعیوں کو حاکم بنادیں۔ سورۃ المائدۃ میں اللہ تعالیٰ نے ساتویں آیت میں مسلمانوں سے اپنے اس عہد کا ذکر کیا ہے جس کا مرکزی عنوان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، پھر انہیں انصاف وتقوے کی تلقین کی ہے اور یہ حقیقت ان پر واضح کی ہے اللہ دلوں کا حال جاننے والا ہے، یعنی ظاہر میں اسلام اور عہد کی پابندی کے بعض مظاہر اور پس پردہ کچھ اور ہو تو کوئی حاصل نہیں اس لیے کہ إن الله عليم بذاب الصدور (آل عمران:۱۱۹) (ترجمہ: اللہ سینوں میں چھپی عداوتوں کو خوب جانتا ہے) اور إن الله خبير بما تعملون (مائدہ:۸) (ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے خوب باخبر ہے)، پھر عہد کی پابندی کرنے والے اہل ایمان کو بشارت اور تکذیب کرنے والے کفار کو وعید سنائی گئی ہے، پھر قرآن کی معجزانہ ترتیب دیکھیے خاص طور پر یہاں مسلمانوں کو ان خطرات سے نجات پاجانے کی نعمت یاد دلائی گئی جن سے گزر کر اب وہ ریاست مدینہ میں پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے، پھر دیکھیے قرآن کا انداز بیان کہ اسی سیاق میں بنی اسرائیل کے عہد کا بھی تذکرہ کرتا ہے، اور عہد کی علامت کے طور پر کچھ اعمال صالحہ کا تذکرہ کرتا ہے اور پھر ارشاد فرماتا ہے فمن كفر بعد ذلك منكم فقد ضل سواء السبيل (مائدہ:۱۲) (ترجمہ: پھر اس کے بعد کوئی کفر کرے گا تو صحیح راستہ سے بھٹک جائے گا)، خدا تعالیٰ سے کیے گئے عہد سمع وطاعت کو توڑنے، دین میں تفریق وتقسیم وتحریف کرنے کے نتیجہ میں پھر خدا تعالیٰ نے ان کو دی گئی سزا کا تذکرہ کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں فبما نقضهم ميثاقهم لعنهم وجعلنا قلوبهم قاسية (مائدہ:۱۳) (ترجمہ: ان کے اپنے عہد وپیمان کو توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی، اور ان کے دل سخت کر دیئے)، یہ سزا ہے جو عہد خداوندی کو توڑنے کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کو ملی اس کے الفاظ پر غور کیجئے اور امت اسلامیہ بالخصوص شاہان عرب کی صورت حال کا مشاہدہ کیجئے اور مذکورہ بالا سوالات کا جواب دیکھیے، سب پریشان ہیں کہ ساحل سمندر پر پڑے بچے کی لاش (ایسے لاکھوں بچے ہیں جن کا ذکر تک نہیں ہوتا) سے عرب ملکوں کے حکمرانوں پر لرزہ کیوں نہیں طاری ہوا، جواب قرآن سے لیجئے، اور آگے بڑھیے اس عہد کو کس طرح توڑا گیا اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا يحرفون الكلم عن مواضعه ونسوا حظاً مما ذكروا به (مائدہ:۱۳) (ترجمہ: الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹادیتے ہیں یعنی تحریف کرتے ہیں اور جو تنبیہات اور نصیحتیں انہیں کی گئی تھیں ان کے بڑے حصہ کو وہ فراموش کر چکے ہیں) بالخصوص یہ دوسری بات جو کہی گئی اس میں جواب تلاش کیجئے، کیا ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے اسلام کی بیشتر تعلیمات کو فراموش کر دیا، اس کی اکثر نصیحتوں اور تنبیہات سے ہم دامن بچانے لگے، ہم نے اسلامی نظام کے مقابلہ عالمی نظام، سودی نظام کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا، کوئی صرف نماز کی محنت میں لگ گیا تو کوئی زکوۃ کی فضیلت بیان کرنے لگا، کسی کو تسبیح ومناجات سے فرصت نہیں تو کسی کو فقہی موشگافیاں بیٹھنے نہیں دیتی، کوئی مدرسہ وخانقاہ کی تفریق میں الجھا ہوا ہے تو کوئی اللہ کے راستے اور مسجد کے کاموں کے تعین کو دین کی خدمت تصور کر بیٹھا ہے، قرآن کا فہم اور مکمل دین کا تصور تو جیسے عنقاء ہو گیا ہے، کیا سمع وطاعت کے اس عہد میں تفریق وتخصیص وتقسیم تھی، کیا جزئیات پر عمل کا عہد کیا گیا تھا، یا یہ اقرار کیا گیا تھا کہ نماز اسلامی ہوگی، تعلیم مغربی ہوگی،

کھانا امریکی ہوگا، دماغ اسرائیلی ہوگا، دل مادی ہوگا، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور دیگر شعباہائے زندگی کے طریقہ کار وہ ہوں گے جن سے دنیا متفق ہوگی، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا پھر جب اس کی خلاف ورزی کی گئی تو باہم برسر پیکار ہونا اور اقوام عالم کے لئے نوالۂ تر بن جانے میں تعجب کیا، یہیں پر نصاری کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے پھر یہ بات دہرائی گئی ہے فنسوا حظاً مما ذکروا به اور پھر سزا کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے فأغرينا بينهم العداوة والبغضاء إلى يوم القيامة (مائدہ:۱۴)(ترجمہ: ہم ان دونوں فرقوں، یہودیوں وعیسائیوں کے درمیان تا قیامت نفرت وعداوت کی آگ بھڑکا دی ہے) اور اس پورے قضیہ کو دوسری جگہ پر بہت واضح انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے یہ بات سمجھ میں صاف آجائے کہ قرآن کریم مکمل اسلام پر عمل کا مطالبہ کرتا ہے جس کی پیغمبر علیہ السلام نے عملی تصویر پیش کی ہے، اس کے لیے کوشاں رہنا، حتی الوسع اس پر عمل کرنا اور اس کے تصور کو عام کرنا ضروری ہے اسی میں امت مسلمہ اور انسانیت کے بقاء کی ضمانت ہے، ورنہ اجزاء کتاب وسنت کو حرز جاں بنانے اور اسلام کے اکثر حصہ کو ترک کرنے کی پاداش میں ذلت ورسوائی کا عذاب ہمارے لیے بھی مقدر ہوگا جس کی وعید اہل کتاب کو یوں سنائی گئی ہے۔

أفتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض فما جزاء من يفعل ذلك منكم إلا خزى فى الحيوة الدنيا ويوم القيمة يردون إلى أشد العذاب، وما الله بغافل عما تعملون۔ (بقرۃ:۸۵)(ترجمہ: تو کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو، ایسا کرنے والوں کی سزا یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں انہیں رسوا وذلیل ہونا ہے اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں گھرنا ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے)

خدا کے دین کا موسی سے پوچھئے احوال:

قرآن مجید ایک آفاقی کتاب ہے، اس کی تعلیمات بھی آفاقی ہیں اور اس کی طرف بلانے کا انداز یعنی طریقۂ دعوت بھی آفاقی اور متنوع ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة، اس حکمت کا تقاضہ ہے کہ مخاطب کی رعایت کی جائے، اس کی ذہنی وفکری حالت کو پیش نظر رکھا جائے اور اس کے مطابق اس کو مناسب اور بہترین نصائح سے مستفید کیا جائے، حضور پاک علیہ السلام سے صحابہ کرام مختلف مواقع پر سوال کیا کرتے تھے، کہ یارسول اللہ ہمارے لیے کون سا عمل افضل ہے، حضور پاک ﷺ مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے کبھی جہاد کی تلقین فرماتے تو کبھی نفل عبادات کی بابت فرماتے کبھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کو افضل قرار دیتے کبھی صدقات کو افضل قرار دے کر عمل پر ابھارتے کبھی ذکر کی بابت ارشاد فرماتے، مطلب صاف ہوتا تھا کہ یہ سارے ہی اعمال افضل ہیں، مختلف مواقع پر ترجیحات کے مطابق ان کی درجہ بندی تو کی جاسکتی ہے لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے پر اس طرح فوقیت نہیں دی جاسکتی کہ ایک کو دین تصور کیا جائے اور اس کے علاوہ کو دین کا کام ہی نہ سمجھا جائے یا اگر کسی درجہ میں سمجھا جائے تو استخفاف بہرحال دامن گیر رہے، حضور پاک ﷺ کو حکم فرمایا گیا، يا أيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك وإن لم تفعل فما بلغت رسالته (مائدہ:۶۷)(ترجمہ: اے پیغمبر آپ کی طرف پروردگار کے پاس سے جو نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہونچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔) اور ظاہر

ہے کہ آپ نے اپنے رب کے پیغام کو قرآن کی شکل میں امت تک پہنچایا، اور احادیث مبارکہ کے ذریعہ اس کی بہترین تشریح فرمائی، اس کے لیے آپؐ نے تعلیم وتزکیہ، تلاوت آیات وتدریس اور خطبات وغیرہ کو بطور وسیلہ اختیار کیا، کبھی آپ وعظ وتلقین فرماتے، کبھی صحابہ کے حلقوں میں سوالات کے جوابات کے ذریعہ تعلیم فرماتے، کبھی اجتماع عام میں خطاب فرماتے، کبھی بہ نفس نفیس چل کر جاتے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلاتے، جس طرح کا مخاطب ہوتا، حالات کا جیسا تقاضہ ہوتا اسی کے مطابق رسول اللہ ﷺ حکمت ومصلحت اختیار فرماتے، چنانچہ کبھی حد درجہ نرمی کا اظہار فرماتے، کسی موقع پر آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا، کبھی آپ کے صحابہ آپ کے چہرے سے ناگواری کے اظہار کو سمجھ لیتے، کبھی بات صلح ومعاہدے تک پہنچتی، کبھی جنگ کی نوبت آتی، اسی پسِ منظر میں دیکھیے بدر واحد کی حکمت عملی بالکل مختلف ہے، اور نوبت آئی تو خندق کھودنے کا اجتہاد بھی موجود ہے یہی حال آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کا ہے، آراء مختلف ہیں، اختلاف موجود ہے لیکن متانت وسنجیدگی غالب ہے، اسلام کی فکر دامن گیر ہے اور واقعی اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اصلی سامنے ہے اس لیے اختلاف بس ایک حد تک ہے، بلکہ کسی عمل کی ابتدا تک ہے اس کے بعد پھر عمل اور جہد مسلسل کی مثالیں ہیں۔

علمائے امت نے بھی قرآن وسنت اور سیرت رسول کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کیا اور جب جیسی ضرورت ہوئی اس کے مطابق امت کو کام میں لگا دیا، کبھی علماء نے فقہ کی تدوین پر زور دیا کبھی احادیث کی تنقیح کا فریضہ انجام دیا، کبھی رد بدعات پر زور صرف کیا تو کبھی توحید کی دعوت کو لے کر صحراء صحراء پھرے، کبھی خانقاہوں کو آباد کیا تو کبھی مدارس میں مسند تدریس سنبھالی، کبھی خاموش دعوت سے انقلاب برپا کیا تو کبھی میدان جنگ میں مورچہ سنبھالا، کہیں مسائل کی تعلیم کو رائج کیا کبھی فضائل کے ذریعہ عمل پر ابھارا، علم کلام کے ذریعہ بھی اسلام کا دفاع کیا، قلم کو بھی اسلام کا خادم بنایا، زبان کی توانائی بھی اسی کی خدمت میں صرف کی، غرض کہ ہر زمانے کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے عمل کیا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کیا، اس پورے عرصہ میں اور تاریخ کے بے رحم اور سچے آئینہ میں کہیں یہ مثال نہیں ملتی کہ فقیہ نے اس بنیاد پر کسی محدث کی پگڑی اچھالی ہو کہ دین کا اصل کام تو مسائل کا استنباط ہے، یا کسی واعظ وداعی اور پیر خانقاہ نے کسی فقیہ ومدرس کے عمل کو بے کار وعبث قرار دے دیا ہو، یا متکلمین نے مصنفین کو یا اہل قلم نے واعظین وخطباء کو بے معنی ثابت کیا ہو، بلکہ درحقیقت سب ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں، یا مکمل اسلام کی دعوت پر محنت ملتی ہے، یا پھر الإیمان بضع و سبعون شعبة (مسلم:۱۵۲) کی حقیقت ملحوظ رکھتے ہوئے کسی ایک جزء پر دوسروں کی افادیت تسلیم کرتے ہوئے محنت کی مثالیں ملتی ہیں۔

لیکن آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ اگر سو سال - پچاس سال پہلے ہمارے کچھ بزرگوں نے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر کوئی حکمت عملی اختیار کی تو ہم اس میں ایک انچ ترمیم کے لیے تیار نہیں، خواہ صورت حال کچھ ہو، حالات کے تقاضے کیسے ہی تبدیل ہو گئے ہوں لیکن ہم اسی حکمت عملی پر عمل کے لیے بضد ہیں، ہمارا یہ طریقۂ کار اور مزاج خود ان بزرگوں کی حکمت عملی کے خلاف ہے، کیوں کہ انہوں جس زمانے میں جو حکمت عملی اور ترتیب ونظام اختیار کیا وہ اس وقت کے لحاظ سے ضروری اور مفید تھا اور ہم جس

زمانے میں اس تبدیلی سے گریزاں ہیں وہ عقل واجتہاد اور حکمت ودانائی کے خلاف ہے، کل جو چیز Upto date تھی آج وہ Out of date ہوچکی، مستقبل میں یہی اصول ہمارے آج کے تجدیدی کاموں پر نافذ ہوگا۔ پھر اگر کچھ لوگ چاہیں کہ قرآن و سنت کے ماخذ سے استنباط کرتے ہوئے اور اسلاف کے تعامل سے استدلال کرتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کچھ اقدامات کیے جائیں تو ہائے واویلا اس طرح شروع ہوتی ہے گویا کوئی نیا فرقہ وجود پذیر ہوگیا ہو، علمی اختلاف مضبوط اور صحت مند قوموں کے لئے ضروری ہیں، لیکن ان میں متانت وسنجیدگی کا فقدان پوری قوم کو روبہ زوال کردیتا ہے، آج صورت حال کچھ ایسی ہی ہے، نظریاتی وفکری اور فقہی اختلافات نے تحزب وفرقہ بندی کا روپ دھارلیا ہے، ہر ایک جماعت کا اپنا مستدل اور اپنا شیخ ہے وہ اسی کو اصل اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے، ہم تو اس پر بھی راضی ہیں کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھے لیکن ذرا اس قرآنی اصول کو پیش نظر رکھے وتعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان (مائدہ:۲)(ترجمہ: نیکی اور تقوی کے کاموں میں آپس میں تعاون کرو(یک دوسرے کی مدد کرو) اور گناہ اور زیادتی کے کسی عمل میں شریک نہ ہو) حکم قرآنی یہ ہے کہ نیکی اور تقویٰ کے جو بھی کام ہوں ان میں باہمی تعاون کیا جائے اور گناہ وفساد کے کاموں میں تعاون سے اجتناب کیا جائے۔

لیکن اف رے بدقسمتی آج ہم اسلام کو کس قدر تقسیم کرنے اور توڑنے کا ارتکاب کررہے ہیں، ہر شخص اعلائے کلمۃ اللہ کا دعوے دار ہے لیکن اخلاص سے عاری ہے، جس کے نتیجہ میں باہمی تعاون مفقود ہے، عنوان خدمت دین ہے، لیکن پس پردہ کہیں ذاتی مفادات تو کہیں جماعتی اور گروہی تعصبات وامتیازات جنم لے چکے ہیں، اسی لیے ہر شخص اپنی جماعت اور اپنے نظریات کا داعی بن چکا ہے، ہر شخص اپنے کام کو ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق قرار دے رہا ہے، اور بدترین المیہ یہ ہے کہ انسانی اجتہادات کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے گویا وہی دین کا مغز ہو، ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ''یہی'' راہ نجات ہے، یہ ''ہی'' اصل ہے، یہ ''ہی'' خدمت دین ہے، اس میں ''ہی'' دنیا وآخرت کی کامیابی مقدر ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ خدمت دین کے دعوے کے ساتھ سب ایک دوسرے سے دور ہیں، بلکہ بعض تنظیموں اور بعض جماعتوں کو ایک دوسرے سے ایسی نفرت ہے گویا ایک دین کو پھیلانے میں مشغول ہے اور دوسری دین کو ڈھانے کا کام کررہی ہے، اسی بنیاد پر مسجدیں تقسیم ہوگئی ہیں، مدرسوں کی افادیت پر سوالیہ نشان لگایا جانے لگا، کوئی خانقاہوں کی فضیلت ثابت کرنے لگا تو کوئی ''اللہ کے راستہ'' کے گن گانے لگا، یہ حقیقت نظروں سے اوجھل ہوگئی کہ حضور پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے صفہ نبوی پر جس مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، اسی مدرسہ کے فارغین کہیں داعی کے رنگ میں نظر آئے کہیں خانقاہوں کو آباد کیا، کہیں یونیورسٹیاں تعمیر کیں تو کہیں فوج کی کمان سنبھالا، کبھی ذکر کے غلغلے بلند کیے تو کہیں پہاڑوں کے جگر چاک کیے، یہ کج فہمی معاشرے میں پھیلانے کا جرم کرنے والے یا تو سیرت سے واقف نہیں یا دین کے فہم سے محروم ہیں کہ یہ سارے کام دین کی خدمت کے وسائل ہیں، جسم اسلام کے اعضاء ہیں، ان میں سے ہر ایک کی اپنی افادیت ہے، ہر ایک کو غذا مدرسہ سے ملتی ہے، ہر ایک اسی وقت تک مفید ہے جب تک اس میں محبت ومعرفت اور زندگی کی حرارت کے ساتھ دوررس ونفع بخش نظر موجود ہے، اگر ان میں تفریق کی جانے لگے گی اور انہیں بھی تقسیم کیا جانے لگے گا تو امت کا حال کیا ہوگا، کاش یہ بات سمجھ میں آجائے اور ہر ایک اس

حقیقت کا ادراک کرلے کہ قرآن کی اصطلاح میں فی سبیل اللہ سے مراد ''جہاد'' ہے، اور اگر اب ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق جہاد موجود یعنی جاری نہ ہو تو دوسرے سب دینی کاموں کو اس کا مصداق قرار دیا جائے گا، ہر وہ کام جو دین کی خدمت کا ہو ''فی سبیل اللہ'' میں شامل کیا جائے گا، خواہ تدریس وتصنیف ہو یا دعوت وتبلیغ، تقریر وتحریر ہو یا تعمیر مساجد وانتظام مدارس، یتیموں کی پرورش ہو یا بیواؤں کی کفالت، اگر یہ تصور عام ہو جائے تو پھر یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی کہ ہر شخص اپنے کام وا پنے نظریات کو ''ہی'' راہ نجات اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا ضامن قرار دینے کے بجائے یوں کہے گا کہ یہ ''بھی'' راہ نجات ہے، یہ ''بھی'' کار خیر ہے، یہ ''بھی'' دینی خدمت ہے، اس میں ''بھی'' دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے، دین کا جب یہ صحیح تصور اور صحیح فہم عام ہوگا تو آپس کی دوریاں ختم ہوں گی اور تعصب وتنگ نظری اور تحزب پسندی سے نجات ملے گی۔

افسوس اور بہت افسوس کی بات ہے کہ ہماری مسجدیں بھی تعصب اور تقسیم سے محفوظ نہ رہیں، کوئی مسجد درس قرآن کے ساتھ خاص کر دی گئی تو کہیں تعلیم حدیث کو ضروری قرار دیا گیا، تو کسی پر گانے بجانے والوں نے قبضہ کرلیا، مسجد انسانی زندگی کا مدار ہے، اس کی ضرورت ہے، پوری انسانی زندگی اس سے مربوط ہے، مسجد مرکز توانائی ہے، اسے حضور پاک نے اس طرح تعمیر کیا تھا کہ انسانی معاشرے کا دل بھی تھی اور دماغ بھی، یہاں ذکر بھی ہوتا تھا مناجات بھی، یہاں دل کے پھپھولے بھی پھوڑے جاتے تھے اور آنسو بھی بہائے جاتے تھے، یہاں مسائل کی تعلیم بھی ہوتی تھی اور فضائل کے حلقہ کے بھی، یہاں قرآن کی تفسیر و تشریح بھی ہوتی تھی اور حدیث کے درس بھی، یہاں سیاسی مشورے بھی ہوتے تھے اور جہاد کی ٹریننگ بھی، یہ مسلمانوں کا علمی، فکری، تہذیبی، ثقافتی مرکز ہوا کرتی تھی، مگر افسوس اسے صرف پانچ وقت کی نمازوں کے لیے خاص کر دیا گیا، یا پھر کسی نظریاتی تعلیم وتنظیم کے طور پر استعمال کرلیا گیا، اس کی اس وسعت پر قدغن لگادی گئی جو اسے مسجد نبوی کے ماڈل نے عطا کی تھی اور جس پر عہد اموی وعباسی اور بعد کے ادوار میں عمل ہوتا رہا، دور آخر میں مسجد کے بہت سے اعمال مدارس اسلامیہ انجام دینے لگے، تو ان کے بارے میں غیر تو غیر اپنے بھی سوالات قائم کرنے لگے انہیں ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق قرار دینے سے بھی کترانے لگے، ان میں زوال تو ممکن ہے لیکن افادیت سے انکار ممکن نہیں، آج بھی ہندوستان میں امت اسلامیہ کا تشخص ان ہی مدارس سے قائم ہے، یہ مدارس انسانی آبادی کے لئے انرجی جنریٹ کرنے والے مراکز توانائی ہیں، اگر یہ مدارس اپنے آپ کو اور اپنے تشخص کو پہچان لیں تو ان میں ذکر کی حلاوت بھی ہے اور فکر کے سوتے بھی، زندگی کی رمق بھی ہے اور توکل کی صحیح تعلیم بھی، ایمان کا نور بھی ہے اور علم حقیقی کے ذخائر بھی، نورِ عبادت کو حاصل کرنے کی تعلیم بھی ہے اور اللہ کے بندوں کو مادیت کی الجھنوں سے نجات دلانے کے اسباب بھی، یہی ان مدارس کی تاریخ رہی ہے اور یہی ان کا طرۂ امتیاز بھی۔ اگر یہ عبادت کی حلاوت، ذکر کی لذت اور ایمان کے نور سے آراستہ نہیں کر سکتے تو پھر ان کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بہ اتفاق علماء عرب و عجم ''فی سبیل اللہ'' میں شمار کیے جانے والے اعمال خیر میں یہ مدارس اسلامیہ سرفہرست ہیں، ان ہی کی کوکھ سے جماعتوں اور تنظیموں کو غذا ملتی ہے اور یہیں دینی وملی شعور کو صحیح سمت دکھائی جاتی ہے۔

ان ہی مدارس کے فارغین ان نبوی کاموں کو کسی نہ کسی درجہ میں انجام دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں جن کو اس طرح شمار کرایا گیا ہے هو الذی بعث فی الأمیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وإن کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (جمعہ:۲) (ترجمہ: وہی ہے جس نے امی قوم (ان پڑھ) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا، جو ان کے سامنے اللہ کے کلام کی آیتیں پڑھ کر سنا رہا ہے، اور ان کا تزکیہ فرما رہا ہے (ان کی عادتوں اخلاق اور ظاہر و باطن کو سنوار رہا ہے اور انہیں قرآن مجید کا علم دے رہا ہے اور حکمت (دانشمندی، تہذیب وسلیقہ مندی) کی باتیں سکھا رہا ہے اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔)

مختصر یہ کہ جب تک نبیؐ کے لئے قرار دیے گئے فرائض منصبی تعلیم وتزکیہ اور تبلیغ وجہاد کے درمیان امت توازن اور توافق جمع وتطبیق کی کیفیت پیدا نہیں کرے گی تب تک مکمل کامیابی اس کا مقدر نہیں بن سکتی، یوں ہی کوئی اپنے کو صاحب علم تو کوئی تبلیغی تو کوئی مجاہد اور کوئی خانقاہی قرار دیتا رہے گا اور امت اپنی ناکامیوں کے باعث سسکتی رہے گی، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کاموں کے درمیان متوازن ربط پیدا کیا جائے اور دین کے مزاج کو سمجھا جائے کہ دین کا ہر شعبہ ایک دوسرے سے مرتبط ومتعلق ہے، کسی کی اہمیت کو کم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی ایک کو دوسرے سے الگ کیا جاسکتا ہے، جب اس مزاج کے ساتھ سب تعاون علی البر کے قرآنی اصول اور اسلام کی آفاقی فکر کے حامل بن کر اس کے آفاقی پیغام کو عام کرنے کے لئے کوشاں ہوں گے تو پھر نتائج بھی انشاء اللہ بہت خوبصورت معنی خیز اور مستحکم ہوں گے۔

خدا کے دین کا موسی سے پوچھیے احوال
آگ لینے جائیں پیمبری مل جائے

اللهم أرنا الأشیاء کما هی.....

ملک کی تشویشناک صورت حال:

ہم نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ بی جے پی کا دماغ اسرائیل ہے، جس طرح دونوں کا دل نسلی امتیاز کے جذبہ سے معمور ہو کر ایک دوسرے سے بڑی مماثلت رکھتا ہے، اسی طرح بے وقت چوراسی پری کرماپوجا اور مظفر نگر فسادات کے موقع پر ہم نے لکھا تھا کہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ملائم سنگھ یادو کا قلبی لگاؤ آر ایس ایس سے ہے اگر چہ ذہنی طور پر وہ مُلّا ملائم ہے کیوں کہ اسی ڈھونگ سے سیاسی بساط پر اس کا وجود باقی ہے، اب ابھی چند روز پہلے ایک جلسہ سرور پور گاڈا میں وزیر اعظم نے جس طرح مودی کی تعریف کی اور کہا کہ جب کبھی بھاجپا پر برا وقت پڑا ملائم نے نکل کر ساتھ دیا ہے، اس سے ان کے تعلقات کی حدود بھی سمجھی جاسکتی ہیں اور ملائم کی سیاسی پہیلی بھی، بلاشبہ قائدین ودانشوران کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، ہم نے کبھی یہ بھی لکھا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو بے شمار مصائب وچیلنجز کا سامنا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بیشتر مسلم ممالک کی بہ نسبت آزاد ہیں اور پرسکون زندگی گزار رہے ہیں، یہ بات اسلام کے ازلی دشمن یہود کو ہر لحہ پریشان کرتی رہتی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کو مسلمانوں کا سب سے

بدترین دشمن قرار دیا ہے اور اس دشمنی میں مشرکین کو دوسرے نمبر پر رکھا ہے لتجدن أشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا (مائدۃ:۸۲) (ترجمہ: آپ ایمان والوں کے سب سے کڑے اور سخت دشمن یہود کو پائیں گے اور مشرکوں کو) جس وقت اس خبر پر نظر پڑی تو افسوس یقیناً ہوا، اور بہت ہوا، لیکن حیرت بالکل نہ ہوئی کہ ۵۷ آئی پی ایس افسران کو اسرائیل کی نیشنل پولیس اکیڈمی ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا ہے اور بالخصوص ان کو غزہ کی سرحد پر تعینات بارڈر سیکورٹی فورسز کا معائنہ کرایا گیا، اطلاع یہ بھی ہے کہ اس وقت اسرائیل سے دفاعی سودا ۴۰ ہزار کروڑ روپے سے تجاوز کر گیا ہے، اسرائیل اب نہ صرف سیکورٹی کے ساز وسامان سپلائی کر رہا ہے بلکہ وہاں کی کمپنیاں اپنے انجینئر بھی ہندوستان بھیج رہی ہیں۔

اس صورت حال سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسرائیل ہندوستان میں اپنے قدم جما رہا ہے، اس کی بھاجپا دوستی اور آر ایس ایس سے تعلقات میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش ہی نہیں، ممکن ہے انجینئرز کی آمد اور سامان کی برآمد میں موساد کا عمل دخل بھی بڑھ جائے جس کا کردار انتہائی سفاک اور گھناؤنا ہے، دنیا میں اس سے بڑی دہشت گرد اور خطرناک کوئی تنظیم نہیں ہے، ہندوستان سے ان پولیس افسران کا اسرائیل جانا انتہائی خطرناک ہے، اس سے جہاں ایک طرف ملک کی داخلی سیکورٹی کو شدید خطرہ لاحق ہوا ہے وہیں دوسری طرف اس کا خدشہ بھی بڑھ گیا ہے کہ اب مسلمانوں کو ہراساں اور ٹارچر کرنے کے نئے نئے طریقے استعمال ہوں گے، ان کو محصور ومحدود کرنے کے طریقے اپنائے جائیں گے، نسلی امتیاز، غلو پسندی، تشدد اور دھوکہ وفریب سے متصف قوم یہود جس کی ٹریننگ کریں گے اس میں ان خصوصیات کا منتقل ہونا یقینی ہے، اس صورت حال میں ہماری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ ہم ہندوستان میں سجدے کی اجازت کو اسلام کی آزادی تصور کرنا چھوڑ دیں اور انتم فی رباط دائم کی دوراندیش نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنی سیاسی صورت حال کو مستحکم کرنے کی متحد ومنظم کوشش شروع کر دیں، مدرسہ وخانقاہ اور جماعت وتنظیم کے خود ساختہ حصاروں سے نکل کر، ذاتی مفادات کی سیاست اور افطار پارٹیوں نیز ٹوپیوں اور رومالوں کی علامت پر شاداں وفرحاں ہونے سے بالا ہو کر ملت کے وسیع تر مفاد میں سوچنا شروع کریں۔

پہلے بہار اور پھر یوپی کا الیکشن قریب ہے، قائدین وعمائدین خود ساختہ حصاروں میں مقید ہیں، نوجوانان ملت قیادت کی تلاش میں حیراں وسرگرداں ہیں لیکن سوائے ان کے استحصال کے اور کچھ نظر نہیں آتا، یہ بات صاف ہے کہ سب سے زیادہ راجیہ سبھا کے ممبران یوپی وبہار سے منتخب ہوتے ہیں۔ ان دونوں جگہ اگر بی جے پی اکثریت حاصل کرتی ہے تو راجیہ سبھا میں اس کو اکثریت حاصل کرنے سے روک پانا مشکل ہوگا، ہم نے لکھا تھا کہ اگر راجیہ سبھا میں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہوگئی تو بی جے پی قانونی طور پر ننگا ناچے گی، ایودھیا میں کچھ دنوں قبل وزیر داخلہ سے رام مندر کی بابت سوال کیا گیا تو صاف جواب تھا کہ راجیہ سبھا میں اکثریت دلاؤ ہم اس کی تعمیر قانون بنا کر کریں گے، بظاہر بہار الیکشن میں ملائم سنگھ نے بی جے پی کی پہلی منزل آسان کر دی ہے، ایک سیاسی سیکولر محاذ وجود میں آیا ملائم سنگھ اس میں پیش پیش تھے لیکن پھر آر ایس ایس کے ذمہ داروں اور امت شاہ سے ملاقات نے ان سے یہ اعلان کرایا کہ وہ بہار کی مکمل سیٹوں پر تنہا الیکشن لڑیں گے، ظاہر ہے اس کا نقصان سیکولر محاذ اور فائدہ بی جے پی کو ہوگا۔

اس وقت ایک زبردست آزمائش ان دونوں جگہوں پر مسلمانوں کی ہے، حیدرآباد کی ایک مقبول پارٹی اور عوام میں مقبول حق گو لیڈر نے یوپی و بہار کی سیاست میں قدم رکھا ہے، ہم یقیناً نظریاتی طور پر ایسی قیادت کو جنم دینے کے حق میں ہیں جس میں تمام مظلوم و پسماندہ طبقات کی نمائندگی ہو لیکن اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں ہو اور اس میں اپنے نظریات کی بالادستی ہو، ہمارے رہنماؤں اور علماء کرام نے جزء وقتی سیاست سے ملت کی کشتی کو منجدھار میں ڈال دیا ہے، ہر ایک کے پاس علحدہ لائحہ عمل ہے، خالی میدان میں اویسی کی آمد حیرت ناک نہیں، لیکن بغیر کسی پیشگی تیاری و تعارف کے اس اقدام کو کس طرح دانشمندانہ قدم قرار دیا جائے سمجھ میں نہیں آتا، چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور علاقائی تنظیموں تک نے اپنی الگ الگ مسجد بنا رکھی ہے، جس کے نتیجہ میں سوائے انتشار کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا اور ہمارے انتشار سے فائدہ اٹھا کر غیروں کے ووٹ غیر منقسم ہو کر شدت پسندوں کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کر دیں گے، گزشتہ یوپی الیکشن میں ایک سیاسی محاذ وجود میں آیا جس کی گھن گرج کا عالم یہ تھا کہ ملائم سنگھ کے بھائی مارے خوف کے صدر اتحاد کے گھر پہنچ گئے اور سیٹوں کی تقسیم کے ساتھ مل کر الیکشن لڑنے کے فارمولے پر رضامندی ظاہر کی، لیکن کیا کیجئے کہ اپنی ہی صف کے میر صادق و جعفر نے فروخت ہو کر اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی، اس موقع پر اگر پیس پارٹی کے سربراہ ہٹ دھرمی نہ کرتے اور اس تقسیم پر راضی ہو جاتے اور اپنے ظاہر کی طرح باطن کے درد کا بھی اظہار کرتے ہوئے فروخت نہ ہوتے تو یقیناً یوپی کے مسلمان دفاع و خوف کی سیاست سے نجات پا کر منزل اقتدار تک پہنچ چکے ہوتے، اس موقع پر نہ دانشور اس اتحاد کے حامی تھے اور نہ عمائدین و قائدین، بلکہ سب دور بیٹھ کر تماش بین تھے، آخر اسے کیا کہا جائے اور کس پر ماتم کیا جائے، اب ایم آئی ایم میدان میں ہے اور ایک نیا سیاسی اتحاد جس نے اس وقت کے اتحاد میں شمولیت سے صاف انکار کیا تھا مقابلہ پر آمادہ ہے، ملت کی نجات کی فکر سب کو دامن گیر ہے لیکن ہر ایک اپنی شناخت و قیادت کا خواہاں و دیوانہ ہے، اس صورت حال میں اگر اب بھی اکابرین و عمائدین ملت نے قبل از وقت درد دل کا درماں نہ کیا اور سب کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر نہ لائے اور اپنے شرائط کی بنیاد پر جمہوریت پسند کہی جانے والی کسی سیاسی جماعت سے مصالحت نہ کی تو نہ صرف غلامی مسلمانوں کا مقدر بنے گی بلکہ بی جے پی اقتدار پر قابض ہو کر بدترین غلامی کا مزہ چکھائے گی اور اقتدار کو مسلمانوں سے صدیوں کے لیے دور لے جائے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

پیام سیرت

مستقبل کی منصوبہ بندی-سیرت کا ایک اہم پہلو

محمد فرید حبیب ندوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک پہلو ہمارے لئے نشان راہ ہے، حضرات محدثین نے آپ کی حیات کا ایک ایک گوشہ اور آپ کے عمل کا ہر ہر نقش محفوظ کر کے ہمارے اوپر بے پناہ احسان کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک نہایت اہم پہلو جس پر ہماری توجہ بالکل نہیں ہے یہ ہے کہ آپ ہمیشہ مستقبل کے حالات کے لئے تیار رہتے تھے۔ کل کیا ہونے والا ہے، کل مصیبت آتی ہے تو اس سے کیسے نمٹنا ہے، کوئی خوشی ملتی ہے تو اس کے بعد آگے کیا کرنا ہے، فتح ملتی ہے تو کیا کرنا ہے اور شکست نصیب میں آئی تو اس کا سامنا کس طرح کرنا ہے، آپ ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر اور دونوں پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے تھے، آپ کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے "لکل حال عنده عتاد" یعنی ہر حالت اور ہر موقع کے لئے آپ کے پاس تیاری ہوتی تھی، آپ ہر طرح کی پوزیشن سے نمٹنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، یہی صفت حضرت عمر فاروق رضی اللہ کی بھی بیان کی گئی ہے، "یرصد لما هو آت عنده من الحذر والطاعة" کہ آپ ہر آنے والی چیز کے لئے چوکنا رہتے تھے کہ اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس سے کیسے نمٹنا ہے اور کوئی نعمت ملتی ہے تو کیا کرنا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کسی بھی لمحہ اور کسی بھی موقع پر غفلت کا شکار نہیں ہوتے تھے، ہمیشہ متنبہ و چوکنا، اور ہوشیار رہتے تھے، دشمن کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور مکرو فریب پر نظر رہتی تھی، آنے والے حالات میں ہمیں کیا کرنا ہے پہلے سے اس کی پالیسی تیار ہوتی تھی، اور قرآن نے بھی اس کا حکم دیا تھا کہ "وأعدوا لهم ما استعطتم من قوة" کہ جتنی استطاعت ہو تم اس کے اعتبار سے دشمنوں کے لئے تیاری کرو۔

سیرت کے اس پہلو کی روشنی میں ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اس پر کس حد تک عمل پیرا ہیں، ہم نے مستقبل کی

کوئی منصوبہ بندی کی ہے یا نہیں؟ کل اگر حالات ہمارے لئے سازگار نہیں رہتے ہیں تو ہمارا کیا طرز عمل اور کیا ردعمل ہوگا؟ ہم نے کبھی سوچا کہ اگر خدانخواستہ ہمارے ملک میں آئندہ کبھی مسلمانوں کے لئے جینا دوبھر ہوگیا تو ہم کیا کریں گے؟

سیرت کا یہ پہلو ہمیں سبق دیتا ہے کہ ہم مستقبل کے لئے پہلے سے لائحہ عمل تیار کریں، منصوبہ بندی کریں اور اس کے مطابق عمل کریں، خوش فہمیوں میں نہ رہیں بلکہ حالات کی سنگینی کا بھی ادراک کیا کریں، اپنی دنیا میں مگن نہ رہیں بلکہ ہر پہلو سے اور ہر میدان کے اعتبار سے اور ہر ضرورت و تقاضے کے لحاظ سے پہلے سے ہی مکمل تیاری رکھیں، بارش کے موسم کے آنے سے پہلے جس طرح ہم خود کو برسات سے بچانے کے لئے اپنے گھروں کو تیار رکھتے ہیں اسی طرح اگر دشمنوں کی طرف سے ہم پر ظلم کی بارش ہونے لگے تو ہمارے پاس اس سے بچنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر ہے تو اسے مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور نہیں ہے تو اس کے لئے تیاری کریں، اگر آج ہلکی سی شورش ہونے لگے تو ہم اس میں اپنے مستقبل کے اندیشے محسوس کرنے لگیں، جسے علامہ اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم حالات کی ستم ظریفی سے بر وقت بھی نمٹنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں چہ جائیکہ پیش بندی کے طور پر تیار ہوں، ہماری مثال بالکل ایسی ہے جیسے پانی گھر میں گھس آئے تب ہم بند باندھیں۔ بلکہ ہم کچھ کرتے بھی ہیں تو صرف حال کو سامنے رکھ کر، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عمل کا نتیجہ ہمیں فوراً مل جائے، جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ پچاس سو سال آگے کی سوچ کر آج کام کریں۔

سیرت کا یہ پہلو ہمیں ابھارتا ہے کہ ہم تعلیمی، اقتصادی، معاشی اور ٹکنالوجیکل ہر اعتبار سے پہلے سے تیار رہیں، ہم یہ سوچ کر چلیں کہ اگر کل ہمارے بچوں کے عقیدہ پر حملہ کیا جاتا ہے، انہیں ذہنی وفکری ارتداد کا شکار بنایا جاتا ہے تو اس کے لئے ہم آج کیا کر سکتے ہیں، اگر کل ہمارے پرسنل لاء پر حملہ ہوتا ہے تو ہمیں اس کے لئے کیا کرنا ہوگا۔

یہ کام ہر ایک کو اپنے اپنے اعتبار سے کرنا ہے، گھر کے ہر ذمہ دار کو اپنے اعتبار سے، فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق اور قائدین کو اپنے معیار کو سامنے رکھ کر۔

ڈوبنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی تیراکی سیکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ پھر ڈوبتے وقت آہ وواویلا مچانے کے علاوہ ہم کچھ نہ کرسکیں گے۔

لہذا ہم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ آنے والے کل سے نمٹنے کے لئے آج ہی منصوبہ بندی کریں، تیاری کریں، اور پھر اس کے مطابق عمل کریں، ہر سال اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور منصوبہ تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔

موجودہ دور میں سیرت کا یہ سب سے اہم پیغام ہے، ہمیں اسے سمجھ کر حرزِ جاں بنانا چاہیے۔

واللہ الموفق والمستعان

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

دارالمصنفین کے چند اساطین

عمیر الصدیق ندوی دریابادی

دارالمصنفین کے تعلق سے اب زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ذکر سے دارالمصنفین کی تاسیس، مقصد اور خدمات کا ایک خاکہ اجمالی ہی سہی سامنے آ گیا۔ ۱۸ر نومبر ۱۴ء کو علامہ شبلی کے انتقال کے بعد اس کے تیسرے دن مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر علامہ کے تلامذہ اور احباب جمع ہوئے، عارضی مجلس اخوان الصفا کے نام سے بنی جس کے صدر مولانا فراہی، ناظم سید صاحب اور مہتمم مولانا مسعود علی ندوی منتخب ہوئے اور اسی وقت سے دارالمصنفین کے قیام کی عملی شکل سامنے آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں اعلی مصنفین اور اہل قلم کی ایک جماعت پیدا کرنا، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا اور تصنیف شدہ کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا، اس مقصد کے تحت دارالمصنفین، دارالاشاعت، دار الطباعت، شعبہ رسالہ معارف، دارالکتب اور شعبہ تعمیرات جیسے شعبہ جات بنائے گئے۔ اب جبکہ سو سال پورے ہو رہے ہیں تو دیکھا جا سکتا ہے کہ، سیرت، سیر صحابہ و تابعین، تاریخ علوم و فنون، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، فلسفہ تاریخ، قرآنیات، حدیث و محدثین، فقہ و فقہاء، شخصیات، فلسفہ و کلام، مقالات و خطبات، مکاتیب، ادب و تنقید، عصری مسائل، مستشرقین جیسے موضوعات پر سینکڑوں کتابیں لکھی اور شایع ہو چکی ہیں۔ عام طور سے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ دارالمصنفین نے جو معیاری اور بلند پایہ نمونہ قائم کیا اس سے ملک کا علمی مذاق بدل گیا، سنجیدہ اہل قلم و مصنفین نے اس کا اثر قبول کیا اور عام طور پر تقلید کی گئی۔

اگر چہ دارالمصنفین کا ایک خاص مقصد اردو زبان کی خدمت بھی ہے لیکن بنیاد اس پر ہے کہ دارالمصنفین کی ہر تحقیق، ہر کاوش اور ہر تحریر کا مقصد اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت ہو یعنی مرکزی نقطہ نظر اسلامیات ہی ہے۔

علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد جو سب سے اہم نام ہے وہ مولانا عبدالسلام ندوی کا ہے۔ مولانا عبدالسلام اعظم گڑھ کے گاؤں علاء الدین پٹی کے رہنے والے تھے، یہ گاؤں علامہ شبلی کے گاؤں بندول سے قریب ہی ہے، اور قرابت صرف زمینی ہی نہیں، خاندانی بھی ہے، مولانا عبدالسلام صاحب فکر و عمل طالب علم تھے، سید صاحب کا ساتھ وہاں بھی تھا، وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے، یعنی سید صاحب سے عمر میں دو سال بڑے تھے، علامہ شبلی کی طرح انہوں نے بھی ابتدائی تعلیم چشمہ رحمت غازی پور

میں حاصل کی تھی، ۱۹۰۶ء میں وہ ندوے میں داخل ہوئے، ۱۹۱۰ء میں فارغ ہوئے اور وہیں عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے، علامہ شبلی نے جن صاحب استعداد طلبہ کی خاص طور پر تربیت کی تھی ان میں مولانا عبدالسلام بھی تھے، ان کے متعلق علامہ فرماتے تھے کہ آگے چل کر یہ اچھے مصنف ہوں گے، مولانا عبدالسلام کچھ دنوں کے لیے ۱۹۱۲ء میں الہلال کے اسٹاف میں بھی داخل ہوئے، لیکن ۱۹۱۴ء میں جب دارالمصنفین قائم ہوا تو وہ اعظم گڑھ آگئے اور پھر پیمان وفا اس طرح باندھا کہ دارالمصنفین کی خاک کا حصہ بنے، دارالمصنفین کے ارکان اعظم میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مسعود علی ندوی کے ساتھ وہ تیسرے رکن اعظم ہیں، مولانا کا انتقال ۴/ اکتوبر ۵۶ء میں ہوا، مولانا عبدالسلام کی کتابیں دارالمصنفین کے لئے سرمایہ افتخار ہیں، اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیرت عمر بن عبدالعزیز، تاریخ اخلاق اسلامی، تاریخ فقہ اسلامی، شعرالہند، امام رازی، حکمائے اسلام، اقبال کامل، ابن خلدون، انقلاب الامم کے علاوہ حیات شبلی اور سیرۃ النبی کی تالیف میں بھی ان کا حصہ ہے۔

مولانا کی یہ کتابیں دراصل مولانا کے علم ومطالعہ، خوبی اخذ و ادراک کی تصویر ہیں، موضوع کوئی بھی ہو لیکن ادب و انشاء کی خوبی سب میں شامل ہیں، یہ مولانا کا خاص امتیاز ہے، شاہ معین الدین ندوی نے خاص طور اس وصف کو بیان کیا کہ وہ ادب وانشاء میں ممتاز تھے اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھی، چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا، ذہن اخاذ پایا تھا، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے۔

مولانا کے بڑے امتیازات ہیں جیسے وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے تصنیف کا کام باقاعدہ کیا، طلبائے ندوہ میں سب سے پہلے مضمون نویسی کا انعام پایا، سب سے پہلے علامہ شبلی کا طرز تحریر اختیار کیا اور سب سے زیادہ کامیاب بھی رہے، ان کی مشہور ترین کتابوں میں اسوۂ صحابہ ہے، صحابہ کرامؓ کی مقدس اور پاکیزہ زندگی چراغ نبوی کا پرتو ہے، اس کا عطر اور جوہر جس خوبی سے مولانا عبدالسلام نے پیش کیا ہے اس سے یہ کتاب صرف احوال ہی نہیں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، معیشت اور تمدن وغیرہ کے تعلق سے واقعات کا مجموعہ ہی نہیں اسلامی تعلیمات کا عملی مرقع بن گئی ہے۔

مولانا کے قلم کا پہلو ہمیشہ علامہ شبلی کے اثرات کی یاد دلاتا ہے کہ خالص تاریخی، خالص مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ خالص ادبی موضوعات پر بھی وہ یکساں دسترس اور کمال علم ونظر کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں اور اس کا حق ادا کردیتے ہیں۔

شعرالہند اور اقبال کامل میں وہ ایک ادیب وانشاپرداز سخن فہم اور سخن سنج کی ایسی صورت میں ہیں کہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ اسی قلم نے اسوہ صحابہ، حکمائے اسلام اور سیرت عمر بن عبدالعزیز جیسی کتابیں بھی دی ہیں، یہ امتیاز دراصل ندوے کی تعلیم کا خوبصورت ترین اظہار ہے۔

یہی حال مولانا سید ریاست علی ندوی، حاجی معین الدین ندوی، مولانا ابوظفر ندوی، نجیب اشرف ندوی، شاہ معین الدین ندوی مولانا مجیب اللہ ندوی، جیسے اہم مصنفین کا ہے، یہ سب ندوے کی تعلیم وتربیت کا بہترین نمونہ بن کر سامنے آئے اور ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لینے میں کامیاب ہوئے جنہوں نے ندوے میں براہ راست تعلیم حاصل نہیں کی جیسے سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاالدین اصلاحی، ڈاکٹر محمد عزیر وغیرہ۔

☆☆☆

صدائے بازگشت

رسول کا پیار چاہیے یا مال و دولت کا انبار؟

محمد فرید حبیب ندوی
استاد: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

فیصلہ کرو! کیا چاہیے؟
خوب سوچ لو!
مسئلہ ایک دو دن کا نہیں!
پوری زندگی کا ہے!
اور پوری زندگی کا بھی کیوں کر!
زندگی کے بعد تک کا ہے!
ہاں تو خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو!
دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔
تمہیں ان میں سے کون سی چیز چاہیے؟؟
خدا کا لاڈلا رسول چاہیے؟
یا اس دنیا کا حقیر ساز و سامان؟
خدا کا دلارا چاہیے؟
یا سونے چاندی کی کھنکھناہٹ؟
خدا کا محبوب چاہیے؟
یا دنیا کا مال و متاع؟
کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ دنیا عیش و عشرت کے سامان لے جائے!
دنیا زر و زمین لے جائے۔
دنیا درہم و دینار لے جائے۔
اور تم! ہاں میرے چہیتو! تم اپنے ساتھ مجھے لے جاؤ؟؟
یہ سوال دنیا کے سب سے لاڈلے اور چہیتے رسول نے
دنیا کی سب سے مقدس و پاکباز ہستی نے
اس نے جس کے لئے آسمان پر کہکشائیں سجائی گئیں۔
ہاں اس نے جس کے لے یہ گل بوٹے آراستہ کیے گئے۔
جس کے لئے فرش کو ہموار کیا گیا۔
جس کے لئے عرش (چھت) کو رفعت عطا ہوئی۔
جس کے لئے آسمان کو زینت بخشی گئی۔
جس کی وجہ سے سورج کو روشنی اور چاند کو نورانیت ملی۔
ہاں اس نے جس کے لئے سب کچھ قربان کر دیا جائے تب بھی کم ہے۔
جس کے لئے اس دنیا کو ٹھکرا دیا جائے تب بھی ہیچ ہے۔
جس کے لئے سب کچھ کھو کر بھی ایک عجیب خوشی حاصل ہو۔
جس کے لئے دنیا میں فقر و فاقہ برداشت کرنے میں عجیب سی لذت محسوس ہو۔
جس کے لئے بے عزتی برداشت کرنے میں وہ حلاوت محسوس ہو جو دنیا کی بڑی سے بڑی عزت کے حاصل ہونے کے بعد بھی نہ ہو سکے۔

جس کے لئے یہ دنیا کیا، ایسی کروڑوں دنیا کو ٹھکرا دیا جائے۔
جس کے لئے دنیا کے سب سے بڑے تاج کو پائے حقارت سے ٹھوکر ماردی جائے۔
جس کے لئے ذلت برداشت کرنے میں عجیب سا سرور حاصل ہو۔
جس کے لئے مار کھانے میں عجیب سا کیف محسوس ہو۔
اس ذات بابرکت نے، اس ہستی بے نظیر نے یہ سوال:
اپنے ان صحابہ کے سامنے پیش کیا۔
جنہوں نے اس سے زندگی جینے کا سبق سیکھا تھا۔
جنہوں نے اس سے زمین پر چلنے کا انداز معلوم کیا تھا۔
جنہوں نے اس سے دنیا کی گلہ بانی کا درس پڑھا تھا۔
جس کی وجہ سے انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی دولت پائی تھی۔
یہ سوال آنجناب محمد ﷺ نے اپنے انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس موقع پر کیا جب ایک جگہ سے مال غنیمت آیا تھا
یہ مال غنیمت ان صحابہ کے لئے ایسے تھا
جیسے کسان کے لئے ابر رحمت
جیسے کسی ماں کے لئے اس کے گمشدہ لخت جگر کی واپسی
جیسے قحط زدہ زمین کے لئے بارش کے قطرے
جیسے جاں بلب شخص کے لئے دو گھونٹ پانی
جیسے یتیم کے سر پر کسی کا دست شفقت
کئی کئی دنوں کے فاقہ کے بعد یہ نعمت میسر آتی تو ایسا لگتا جیسے
مرجھائی کھیتی لہلہانے لگی ہو
جیسے پژمردہ چہرے کھل گئے ہوں
جیسے مسافر کو پانی نظر آنے لگا ہو
جیسے بچے کو عید کے کپڑے مل گئے ہوں
جیسے طفل معصوم کو اس کا پسندیدہ کھلونا ہاتھ آ گیا ہو۔
ایسا ہی اب بھی ہوا، باہر سے کچھ مال غنیمت آیا تو بے چارے صحابہ کو لگا
جیسے اب کچھ دن اس فاقہ کشی سے راحت ملے گی
جیسے پیٹھ سے لگے یہ پیٹ کچھ باہر کو آئیں گے
مگر اس نے جو سب کچھ لٹانے آیا تھا
جو سب کو دے کر اپنوں کو آزماتا تھا
جو سب کو عطا کرتا مگر اپنی بیٹی کو ایک خادم دینے سے بھی انکار کر دیا۔
جو دوسروں پر لٹاتا مگر خود وہ اور اس کے قریبی ساتھی پیٹوں پر پتھر باندھتے۔
جو سب کے لئے خود بھوکا رہتا۔
وہ جس نے سب کے نزع کی تکلیف خود برداشت کرنے کی دعا کی۔
اس نے اس مرتبہ اپنے ان انصاری صحابہ کو اس مال غنیمت میں سے کچھ نہ دیا۔
کچھ انہیں دے دیا جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے تاکہ وہ اسلام سے مانوس ہو جائیں۔
کچھ قریش کے قبائل کو دے دیا۔
اپنے گھر میں کبھی کا ہے کو رکھا تھا، جو اب رکھتا۔
اپنے لئے کہاں، وہ تو دوسروں کے لئے جیتا تھا۔
دوسروں کے دکھ درد خود سہتا تھا۔
اس نے یہ سارا مال لوگوں میں تقسیم کر دیا مگر ان انصاری صحابہ کو کچھ نہ دیا۔
انصار میں سے بعض کی زبان پر حرف شکایت آ گیا کہ
رسول اللہ نے ہمیں کچھ نہ دیا۔
اور یہ حرف شکایت رسول اللہ پر اعتراض نہ تھا۔
بلکہ اس بات کا افسوس تھا کہ ہمیں کچھ نہ ملا۔
جو امید بندھی تھی کہ کچھ دن گھر میں چولہا جلے گا وہ پوری نہ ہوئی۔
اس کی حسرت تھی۔

یہی حسرت ان الفاظ میں زبان پر آ گئی۔
رسول اللہ کو، ہاں اللہ کے لاڈلے رسول کو جب اس کا علم ہوا تو
اپنے ان پیارے صحابہ سے
جنہوں نے اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں لٹانے کی
قسم کھائی تھی۔
جنہوں نے اپنی ہر متاع عزیز کو اس کی راہ میں قربان کرنے کا
عہد کیا تھا۔
آپ نے اپنے ان پیارے صحابہ سے
عجیب سے جذبہ کے ساتھ
جذباتی ماحول میں
ایسے الفاظ میں جنہیں سن کر ان کی
گھگھی بندھ گئی۔
کلیجہ منھ کو آنے لگا
دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں۔
آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
داڑھیاں تر ہو گئیں۔
انہیں کہاں اندازہ تھا کہ آپ اس حد تک فرما سکتے ہیں۔
انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ آپ ان سے اتنے جذباتی ہو سکتے ہیں۔
آپ نے ان سے پوچھا:
کیا تم اس سے خوش نہیں کہ اور لوگ اونٹ اور بکریاں لے
جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے جاؤ۔
لوگ آسمان سے تارے توڑ کر لے جائیں۔
زمیں کے مدفون خزانے نکال کر لے جائیں۔
اور تم اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤ جو
اللہ کا رسول ہے
اللہ کا دلارا ہے
اللہ کا چہیتا ہے
جسے پا کر سب کچھ کھو دینا منظور۔
جسے راضی کر کے سب کی خفگی قبول
جسے خوش کر کے سب کی ناخوشی گوارہ
بولو! رسول کا پیار چاہیے یا مال و دولت کا انبار؟
رسول کی محبت یا زر و جواہرات کی کثرت؟
یہ سننا تھا کہ بے چارے صحابہ کی چیخیں نکل گئیں۔
آواز گلے میں پھنس گئی۔
ہونٹ کانپنے لگے۔
کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں؟
آپ یہ کیسا امتحان لے رہے ہیں؟؟
ہمیں آپ چاہئیں آپ، بس آپ، اور کچھ نہیں۔
آپ کو چھوڑ کر ہمیں نہ اس دنیا کی حکومت قبول ہے نہ اقتدار
نہ دنیا کے خزینے منظور ہیں نہ دفینے زمین کے
نہ عزت کی خواہش ہے نہ رفعت کی
نہ قارون کے خزانے نہ کسری کا تاج
نہ سکندر کی حکومت نہ ذوالقرنین کی سلطنت
آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔
آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔
آپ کے لئے تو ہم اپنی جان کا ایک ایک سانس دے سکتے ہیں۔
اپنے خون کا ایک ایک قطرہ بہا سکتے ہیں۔
یہ چند درہم و دینار کیا حیثیت رکھتے ہیں، آپ کے لئے تو ہم
اپنے معصوم بچوں کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔
اپنے ماں باپ کو قربان کر سکتے ہیں۔
آپ کے لئے تو دنیا کا بڑے سے بڑا گھاٹا اور نقصان
ہمیں منظور ہے۔

میرے بزرگو! دوستو!

یہی سوال آج آپ ﷺ کی روح ہم سے کر رہی ہے۔

آپ پوچھ رہے ہیں کہ اے میرے امتیو!

مجھے ناراض کر کے تمہیں حکومت واقتدار چاہیے؟

زر وجواہرات کی فراوانی اور مال ودولت کی ارزانی چاہیے؟؟

میرا دل دکھا کر سود اور رشوت کا ڈھیر چاہیے؟؟

میرا دل توڑ کر حرام چیزوں اور حرام کھانوں کی خواہش ہے؟؟

میری آنکھوں سے آنسو بہا کر مغربی تہذیب کی لعنت چاہیے؟؟

میری روح کو تڑپا کر مغربی حکمرانوں کی تقلید چاہیے؟؟

تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ یہ چاہیئے یا میری محبت؟؟

اگر تم میری محبت چاہتے ہو!

اگر تم مجھے چاہتے ہو۔

تو دنیا کی لذتوں کو بھول کر

دنیا کے عیش وعشرت کو فراموش کر کے

دنیا کی چکاچوند ترقی سے نظریں جھکا کر

دنیا کی للچاتی زیبائش سے نظریں چرا کر

صرف میری طرف دیکھو

میری تعلیمات کی طرف دیکھو

اسلام کے احکام پر عمل کرو

صرف حلال کھاؤ چاہے فقر وفاقہ برداشت کرلو۔

صرف جائز کام کرو چاہے غربت کے طعنے سہہ لو۔

صرف مجھے خوش کرنے والے کام کرو خواہ دنیا تم سے ناخوش ہو جائے۔

مجھے خوش کرنے کے لئے دنیا کی رسوائی ملے تو رسوائی برداشت کرلو۔

میری وجہ سے دنیا تمہیں دقیانوسیت کے طعنے دے تو بھی سہہ لو۔

میری غلامی کی وجہ سے دنیا تمہیں بے عقلی کے کچوکے لگائے تو اسے بھی جھیل لو۔

تم فیصلہ کرلو کہ یہ حقیر دنیا چاہتے ہو یا مجھے؟؟؟

مجھے ناراض کر کے کچھ پایا بھی تو کیا پایا؟؟

میرا دل دکھا کے کچھ حاصل کیا بھی تو کیا کیا؟

میری تعلیمات سے انحراف کر کے دنیا کی دولت حاصل کی بھی تو کیا تیر مارا؟

یہ سب کچھ چند روزہ ہے۔

میری محبت زندہ جاوید ہے۔

یہ سب کچھ عارضی ہے۔

میری محبت کے نتیجہ میں ملنے والی کامرانی دائمی ہے۔

تم عارضی کامیابی چاہتے ہو یا دائمی؟

فانی دنیا کے طلبگار ہو یا باقی آخرت کے؟

تم میری محبت کا دم بھرتے ہو تو یہ غفلت وبے حسی کیسی؟

تم میری غلامی پر فخر کرتے ہو تو یہ دوسروں کی تقلید کیوں کر؟

پھر آپ شکایت کے انداز میں فرماتے ہیں:

تمہاری طرف سے جواب کیوں نہیں ملتا؟

میرے انصاری صحابہ نے تو جواب میں کہا تھا کہ ہم اللہ کے رسول سے راضی ہیں مگر تم خاموش کیوں ہو؟؟

میرے امتیو!! مجھے چن لو، مجھے اختیار کرلو، اگر تم ایسا کرلو گے تو یہ سب کچھ تمہارا ہے!!!

یہ دنیا تمہاری۔

یہ عرش یہ فرش سب تمہارا۔

اور اگر مجھ سے بیگانہ ہو گئے تو.....

مجھے چھوڑ گئے تو.....

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

اچھے اور برے ناموں کے اثرات

کفیل احمد ندوی
استاد مدرسہ دارالتعلیم والصنعت جاجمؤ، کانپور

انسانی طبیعت وفطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اسکی ہر چیز میں حسن و جمال، خوبصورتی، ندرت، جدّت اور انوکھا پن ہو، اس طبعی وفطری تقاضہ کی وجہ سے انسان ہر چیز میں حسن و جمال، خوبصورتی وندرت کا خیال رکھتا ہے، خوداللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین سانچہ کے ساتھ پیدا کیا، " لقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم "(۱)، ہم نے انسان کو بہترین وخوبصورت ساخت وترکیب کے ساتھ پیدا کیا ہے، اسکو شاندار شامہ عطا کیا ہے، اس لئے اگر انسان خوبصورتی کو اختیار کرتا ہے تو یہ طبیعت کا تقاضا ہے اور محبوب وپسندیدہ چیز ہے، ایک صحابی نے نبی پاکؐ علیہ الصلاۃ والسلام سے دریافت کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا جوتا شاندار وخوبصورت ہو کیا یہ کبر وغرور میں شامل ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ' إن الله جميل يحب الجمال ' (۲)، اللہ خود جمیل ہے اور ہر چیز وکام میں جمال وخوبصورتی اور سلیقہ کو بھی پسند کرتے ہیں، اسی لئے ہماری شریعت میں چھوٹی ومعمولی چیزوں میں بھی اسکا خیال کرنے کا حکم ہے، یہاں تک کہ بچوں کے ناموں کے سلسلے میں بھی بے شمار ہدایات موجود ہیں، شریعت میں بہترین اور اچھے معنیٰ ومفہوم والے ناموں کو پسند کیا گیا ہے، جس طرح والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت وحفاظت کریں، ان کی نشوونما اور بہترین تربیت وتعلیم کی فکر کریں وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ والدین بچوں کے اچھے نام تجویز کریں، اچھے نام اچھی علامتوں کے مظہر ہوتے ہیں اور اچھے مظاہر اللہ کو محبوب وپسند ہیں، والدین کی سب سے اہم ذمہ داری اپنے بچوں کا اچھا وخوبصورت نام رکھنا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا' حق الولد على الوالد أن يحسن أدبه و يحسن اسمه' (۳)، باپ پر بچہ کا یہ بھی حق ہے کہ اسکا اچھا نام رکھے، اچھا نام وہ ہے جو خدا کے ۹۹ ناموں میں سے کسی ایک نام سے پہلے عبد لگا کر ترکیب دیا گیا ہو، اللہ کے ناموں میں سے کسی بھی نام سے پہلے عبد بڑھا کر تجویز کیا گیا نام اللہ کو سب سے محبوب وپسندیدہ ہے۔ حدیث مرفوع ہے، ' إن من أحب أسمائكم إلىٰ الله عبد الله و عبد الرحمن'(۴)، عبداللہ وعبدالرحمٰن کے پسندیدہ ومحبوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں ناموں میں بندے کی عبدیت، غلامی وعاجزی، فروتنی وتواضع کا اور اللہ کی وحدانیت ویکتائی کا اظہار واعلان ہے(۵)، اور اس طرح کے ناموں سے بار بار اللہ کی یاد بھی تازہ ہوتی رہتی ہے، اور دین وشریعت کی بنیاد ہی اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے پر رکھی گئی ہے، اس لئے ایسے ناموں کو پسند کیا گیا جن میں اللہ کا کوئی صفاتی نام موجود ہو کہ بندے کی عبدیت وغلامی کا اظہار بھی ہو گیا اور اللہ کا ذکر بھی ہو گیا(۶)، اس طرح کے ناموں کے پسند ہونے کی ایک وجہ اور ہے جسکی طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اشارہ کیا

ہے، لکھتے ہیں 'اس طرح کے ناموں میں کافروں، بت پرستوں اور بددینوں کا مقابلہ بھی ہے، کیونکہ کفار ومشرکین آج بھی اپنے بچوں کے نام اپنے بتوں، معبودوں، دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں پر رکھتے ہیں'(۷)، اس لئے اللہ کے نام پر نام رکھنے سے ان کا مقابلہ ہوجاتا ہے، اسی طرح وہ نام بھی اچھا ہے جو پیغمبروں کے نام پر رکھا گیا ہو کیونکہ یہ نام پیغمبروں کے ساتھ نسبت وتعلق کو ظاہر کرتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا' تسموا بأسما الأنبياء' (۸)، نبیوں کے ناموں پر اپنی اولاد کے نام رکھا کرو، خود آپؐ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابراہیم رکھا تھا(۹)، ابوموسی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا وہ اسکو حضورؐ کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئے، آپؐ نے اس بچے کے حق میں دعائے برکت کی اور اسکا نام ابراہیم رکھا(۱۰)۔

بچوں کے ناموں کے سلسلے میں بڑی ہوشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے، اگر بچے کے نام میں کسی طرح کی غلطی ہوئی تو قیامت کے دن ندامت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ قیامت کے دن حساب وکتاب اور نامۂ اعمال دینے کیلئے ہر ایک کو اسکے اور اسکے آباء واجداد کے ناموں کے ساتھ پکارا جائیگا(۱۱)۔

آج کل دین سے دوری کی وجہ سے جہالت عام ہے، جسکی وجہ سے ناموں کے سلسلے میں بھی بڑا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے، آج کل لوگ بچوں کے ناموں میں جدّت ونئے پن کا لحاظ کرتے ہیں، ایسا نام رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی کا نہ رہا ہو، خواہ اسکا معنی اور مفہوم کچھ بھی ہو اور پوری زندگی اسی خراب نام کے ساتھ گذر جاتی ہے، اگر بتلایا اور سمجھایا جاتا ہے تب بھی بدل کر دوسرا اچھا نام رکھنے کی توفیق نہیں ہوتی، علامہ طبریؒ فرماتے ہیں' ایسا نام نہیں رکھنا چاہئے جسکے معنی ومفہوم میں غلطی ہو اور نہ ہی ایسا نام رکھنا چاہئے جس سے اپنی تعریف وبڑائی اور کبر وغرور کا اظہار ہوتا ہو، اور نہ ہی ایسا نام رکھنا چاہئے جسکے معنی میں گالی شامل ہو، اس طرح کے ناموں کو بدل دینے کا حکم ہے'(۱۲)، امام نوویؒ نے باب قائم کیا ' باب استحباب تغيير الاسم الىٰ أحسن منه'(۱۳)، امام نوویؒ نے اس باب کے تحت ایسے بہت سارے واقعات کا ذکر کیا ہے جن میں حضورؐ نے غیر مناسب ناموں کو مناسب ناموں میں بدل دیا(۱۴)، ایک مرتبہ ایک وفد مدینہ میں حاضر ہوا، آپؐ نے ایک صاحب سے نام معلوم کیا تو انہوں نے بتلایا کہ میرا نام اصرم ہے، جسکے معنی کٹے ہوئے اور دور پڑے شخص کے ہیں، معنیٰ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کو خیر وبرکت کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے آپؐ نے ان کا نام بدل کر زرعہ رکھ دیا جسکے معنی کھیتی کے ہیں(۱۵)، ایک صاحب کا نام شیطان تھا آپؐ نے بلایا اور کہا کہ آج سے تمہارا نام عبداللہ ہے(۱۶)، ایک شخص کا نام غراب تھا، غراب کوّے کو کہتے ہیں جو سب سے خبیث پرندہ ہے آپؐ نے ان کا نام مسلم رکھا(۱۷)، جب حضرت حسن پیدا ہوئے تو پہلے انکے والد حضرت علیؓ نے ان کا نام حرب رکھا، حرب جنگ کو کہتے ہیں، آپؐ نے اس نام کو ناپسند کیا کیونکہ جنگ میں خاندانوں کے خاندان تباہ وبرباد ہوجاتے ہیں، اس لئے آپؐ نے ان کا نام بدل کر حسن رکھا(۱۸)، زمین کے ایک خاص ٹکڑے کا نام " عَـقِـرَة" تھا جسکے معنی بنجر وبانجھ کے ہیں، آپؐ نے اس کا نام " خَضِرَة" رکھ دیا جس کے معنی سرسبز وشاداب کے ہیں(۱۹)، حضرت ابن عمرؓ کی صاحبزادی کا نام برّۃ تھا جسکے معنی نیک وپرہیزگار کے ہیں تو نبی پاکؐ نے فرمایا' لاتزكوا أنفسكم الله أعلم بأهل البر منكم'، خود سے اپنی تعریف مت کرو اللہ بہتر جانتا ہے کہ نیک وپرہیزگار کون ہے، اور پھر اس بچی کا نام زینب رکھ دیا(۲۰)، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اچھے ناموں کے اثرات بچوں پر مرتب ہوتے ہیں، نام کے جو معانی ہونگے بچہ وہی معنی وصفات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، جس شخصیت کے نام پر بچے کا نام ہوگا بچہ اسی کے نقش قدم پر چلے گا، صحابی رسول حضرت طلحہؓ نے حضرت زبیرؓ سے کہا کہ میں نے

اپنے بچوں کے نام نبیوں کے ناموں پر رکھے ہیں جب کہ تم نے اپنے بچوں کے نام شہداء کے ناموں پر رکھے ہیں،تو حضرت زبیرؓ نے بڑے پتہ کی بات کہی کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے بہادر بنیں اور اللہ کے راستہ میں شہید ہوں اور تم نہیں چاہتے کہ تمہارے بچے نبی بنیں کیونکہ حضور پاکؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا (۲۱)،حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام اچھے ناموں سے خوش ہوتے، نیک شگون لیتے اور اسکے اچھے اثرات کی تمنا کرتے تھے،صلح حدیبیہ کے موقع پہ قریش نے اپنے کئی سفراء کو بھیجا لیکن بات نہیں بنی، اخیر میں سہیل کو بھیجا،سہیل کے معنی نرم کے ہیں جب آپؐ نے سہیل کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ خوشخبری قبول کرو، سہیل آرہے ہیں،اب معاملہ سہل و آسان ہوجائیگا، سہیل آئے، بات چیت ہوئی اور صلح ہوگئی (۲۲)۔

امام ابوحنیفہؒ کے پڑوس میں ایک متشدد شیعہ رہتا تھا، اس نے اپنے ایک گدھے کا نام ابوبکر اور دوسرے کا عمر رکھا، ایک دن ایک گدھے نے اسکے منہ پر لات ماری، ابوحنیفہؒ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ لات اس گدھے نے ماری ہوگی جسکا نام عمر رکھا ہے، بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی بات درست ہے (۲۳)، سعید بن مسیّب تابعی کہتے ہیں کہ میرے دادا کا نام حَزن تھا حضورؐ نے یہ نام بدلنا چاہا لیکن میرے دادا تیار نہ ہوئے، اس نام کا اثر بعد کی نسلوں میں دل کی سختی اور اخلاقی تشدد کی شکل میں ظاہر ہوا (۲۴)۔

آج کل لوگوں کے اندر بچوں کے ناموں کے سلسلے میں ایک بیماری اور پیدا ہوگئی ہے جسکی وجہ سے ناموں میں بڑی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں،لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے تمام بچوں اور بچیوں کے ناموں میں یکسانیت ہو، سب کا نام ہم وزن ہو، حالانکہ یہ التزام غیر ضروری ہے، اور کبھی کبھی اسکی پابندی بڑی بھونڈی معنویت پیدا کردیتی ہے، اسکی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں (۲۵)۔

اس لئے بچوں کے نام بہت سوچ سمجھ کر پڑھے لکھے بزرگوں سے مشورے کے بعد رکھنے چاہئیں، کیونکہ ناموں اور کسی بھی قوم کی تہذیب وتمدن کے درمیان گہرا رشتہ ہوتا ہے، ناموں میں غلطیوں کی وجہ سے اور غیروں کی تقلید کی وجہ سے مسلم بچوں کے اخلاق خراب ہورہے ہیں اور بچے دین سے دور ہوتے جارہے ہیں، اسکا سب سے بہترین ومسنون طریقہ یہ ہیکہ جب بچہ یا بچی پیدا ہو تو اسکو کسی نیک متبع سنت پڑھے لکھے بزرگ کے پاس لیکر جائے اور اس سے بچے کے حق میں دعائے برکت کی اور نام رکھنے کی درخواست کرے، جو نام بھی تجویز ہو اسکو قبول کرلے، اپنی طرف سے کوئی مشورہ نہ دے جیسا کہ صحابہ کرام کا معمول تھا (۲۶)۔

حوالہ جات:-

(۱) سورۃ التین (۲) مسلم ۹۱ (۳) مسلم ۴ (۴) مسلم ۲۱۳۲ (۵) معارف الحدیث، ج ۶/ ۲۷۳، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی ۲۰۰۵ء (۶) حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲/ ۱۴۵ کتب خانہ رشیدیہ دہلی (۷) ایضاً، ج ۲/ ۱۴۵ (۸) ابوداؤد ۴۹۵۰ النسائی ۳۵۶۵ (۹) البخاری ۶۱۹۸ (۱۰) ایضاً (۱۱) ابوداؤد کتاب الأدب ۴۹۴۸ (۱۲) فتح الباری، ج ۱۳/ ۳۳۷ دارابی حیان القاھرۃ ۱۴۱۶ھ (۱۳) کتاب الاذکار للنوویؒ ص ۳۶۰ ط بیت الأفکار الدولیۃ (۱۴) اسکی تفصیل سنن ابی داؤد کتاب الادب میں دیکھی جاسکتی ہے (۱۵) ابوداؤد ۴۹۵۴ (۱۶) ابوداؤد کتاب الادب، ج ۲/ ۲۷۷، مطبوعہ اصح المطابع (۱۷) ایضاً (۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً (۲۰) ابوداؤد کتاب الادب، الاذکار للنووی، کتاب الاسماء (۲۱) فتح الباری ج ۱۳/ ۳۷۷ (۲۲) خطبات سیرت، سید سلمان حسینی ندوی، ص ۲۶۶/ ط ۲۰۱۰ء (۲۳) تعمیر حیات لکھنؤ (۲۴) البخاری ۶۱۹۰ (۲۵) ایضاً (۲۶) فتح الباری ج ۱۳، کتاب الاسماء، الطبعہ الاولیٰ دارابی حیان القاھرہ ۱۴۱۶ھ

☆☆☆

فقہی مباحث

غذا کے احکام اور علاج کی شرعی مصلحتیں

تحریر: مولانا عبدالباسط ندوی امارت شرعیہ پٹنہ
ترجمہ: ڈاکٹر اشرف علی ندوی ازہری، دارالعلوم ندۃ العلماء لکھنؤ

مذہب اسلام سراپا انسانیت کے مفادات پر مشتمل ہے، عبادات اور معاملات میں زیادہ تر مفادات صحت بدن سے متعلق ہیں، اسلام میں صحت انسانیت کا اتم درجہ خیال رکھا گیا ہے اور اس کو اہم دینی فریضہ کا درجہ دیا گیا ہے، اس دنیاوی زندگی میں جسم کی حفاظت اور اس کا خاص خیال رکھنے نیز اسکے توازن کو مناسب مقدار میں برقرار رکھنے کے سلسلہ میں دینی تعلیمات ونصائح کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

وہ پانچ چیزیں جن کی حفاظت مذہب اسلام میں واجب ہے مندرجہ ذیل ہیں: دین، نفس، عقل، نسل اور مال، چنانچہ ان میں تین چیزیں ایسی ہیں جو بدن سے متعلق ہیں۔

بدن اس وقت تک تندرست وتوانا نہیں رہ سکتا جب تک کہ اسے فاسد چیزوں اور بیماریوں سے محفوظ نہ رکھا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی نے ہر مسلمان کو پاک وحلال روزی کا حکم دیا، اللہ تعالی فرماتا ہے ﴿کلوا من طیبات مارزقنکم﴾ (بقرۃ:۱۷۲) ''ہماری عطا کردہ پاک روزی سے کھاؤ'' حرام کردہ وناپاک چیزوں سے اجتناب برتنے کا حکم دیا، اور جسم کو نقصان پہونچانے والی بہت ساری غذائیں اور جانور جن میں خنزیر، شراب اور مردار وغیرہ ہیں، سب کو حرام قرار دیا۔

حدیث شریف میں رسول اللہ نے حرام چیزوں سے متنبہ فرمایا، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: ''ہر گوشت جو حرام طریقہ سے پیدا ہو اس سے بہتر آگ ہے'' (شعب الایمان: حدیث ۵۷۶۰/) اور اسی طرح آپؐ نے حلال رزق کی ترغیب دی ہے، حدیث میں وارد ہے کہ ''جس شخص نے بغیر کسی سے سوال کئے ہوئے حلال طریقہ سے دنیا طلب کی، اور اس کے لئے امکان بھر کوشش کی، نیز پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہا، تو قیامت کے دن وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا (شعب الایمان: حدیث ۱۰۳۷۵/) اور آپؐ نے فرمایا ''جس نے حلال طریقے سے روزی کمائی اور کسی سے سوال نہیں کیا تو قیامت کے دن نبیوں اور صدیقوں کی صف میں کھڑا ہوگا'' آپ نے اپنی شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔ (کنزالعمال للمتقی الہندی: حدیث ۹۲۴۸ (الخطیب والدیلمی عن ابی ہریرۃ، (۴) صحیح مسلم: حدیث ۲۳۹۳/)

نیز جو شخص پاک وحلال روزی کی تمیز نہیں کرتا اسکی دعا قبول نہیں ہوتی، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاک ہے، پاکی کو پسند فرماتا ہے، اللہ تعالی نے مؤمنین اور رسولوں کو یکساں حکم دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے: ''اے رسولو! پاک روزی سے کھاؤ اور اچھے اعمال کرو'' نیز اللہ تعالی نے فرمایا: ''اے ایمان والو! پاک روزی سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے، پھر فرمایا: ''ایک شخص دور دراز کا سفر کرتا ہے، پراگندہ حالت میں ہوتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب اٹھاتا اور کہتا ہے، اے میرے رب! اے میرے پروردگار! حالانکہ اسکا کھانا پینا لباس اور پرورش حرام طریقہ سے ہوئی ہوتی ہے تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی۔(۴)

آیت میں پاک روزی کو اعمال صالحہ پر مقدم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بغیر اسکے اعمال صالحہ ممکن ہی نہیں، اسلئے کہ پاکی کے ذریعہ ہی پاکی کا صدور ہوتا ہے، اور برائی ہی برائی کو جنم دیتی ہے، بعض علماء نے فرمایا: جو حرام کھاتا ہے اس کے اعضاء وجوارح نافرمان ہوجاتے ہیں، خواہ وہ اسکی چاہت سے ہو، یا لاشعوری میں ہو، یا قصداً ہو، اور اسی طرح جس کی غذا حلال ہوتی ہے، تو اسکے اعضاء مطیع وفرماں بردار ہوجاتے ہیں، اور اسے نیکی کی توفیق ملتی ہے (احکام الاطعمۃ فی الاسلام/للدکتور کامل موسی)۔

صحت کی حفاظت:

صحت انسان کے ذمہ اللہ کی امانت ہے، انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی صحت کو ہلاک و برباد کرے، اس پر لازم ہے کہ وہ اسکی حفاظت کرے، اللہ فرماتا ہے: ''اللہ نے مومنوں کی جان ومال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے'' اور فرمایا: ''تم لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''، حدیث پاک میں رسول اکرم نے ترغیب دلائی: ''اللہ کے نزدیک طاقتور مومن بندہ بہ نسبت کمزور بندہ کے زیادہ محبوب ہے'' لیکن دونوں ہی میں خیر کا پہلو ہے، (سنن ابن ماجہ: حدیث: ۴۱۶۸/) رسول اللہ کی تعلیمات حفظان صحت کے سلسلہ میں بھری پڑی ہیں۔

چنانچہ کھانے پینے کے آداب بدن کی حفاظت کیلئے ہی ہیں، اسی طرح استنجاء، غسل، وضو اور مسواک نیز فطری احکام یعنی نظافت وطہارت جیسے دیگر امور میں صحت بدن کے ایسے فوائد ہیں، جنکا شمار ممکن نہیں، اور اسی طرح نماز روزے میں روحانی اور جسمانی دونوں فائدے ہیں، اس کے علاوہ معاشرے کے آداب اور بچے کی رضاعت کے آداب نیز فحاشی وبیہودگی اور نشہ آور اشیاء سے اجتناب برتنا ان سارے امور میں صحت ہی کا فائدہ ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وضو کے فوائد کے سلسلہ میں لکھا ہے: ''طبی تجربہ اور مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے بدن سے زہریلا مواد نکل کر ہاتھ پاؤں چہرہ اور دیگر اعضاء پر جم جاتا ہے، اور پھوڑے پھنسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور جب انہیں دھو دیا جاتا ہے تو یہ فاسد مواد بہہ کر ختم ہو جاتا ہے''۔ (المصالح العقلیۃ: ص/۳۰) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا: اعضاء جسم چہرہ اور سر پر پانی چھڑکنے سے آدمی نیند اور غشی سے افاقہ پالیتا ہے، ایسے شخص کے سلسلہ میں جس کو غشی یا دست کی شکایت ہو یا سینگی لگایا گیا ہو، ایسے لوگوں کے ساتھ انسان کو تجربہ، علم اور اطباء کے احکام پر عمل کرنا چاہئے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ: ج/۱، ص/۱۶۸ باب اسرار الوضو والغسل)

غذا کی تاثیر

انسان کی طبیعت وفطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ ہر لذیذ اور عمدہ/خوش ذائقہ/ذائقہ دار کھانے اور پینے کو پسند کرتا ہے اور وہ اس جانور کی طرح نہیں جو صرف اپنی ضرورت وحاجت کو پورا کرنا چاہتا ہے، بلکہ وہ اعلی سے اعلی اور بہتر سے بہتر کو

پسند کرتا ہے اور اسکو ترجیح دیتا ہے، اور شریعت نے بھی پاکیزہ، حلال اور لذیذ وذائقہ دار کھانے کی ترغیب دی ہے، ابن بطالؒ فرماتے ہیں،" خدا کے اس قول کے بارے میں کسی مفسر کا اختلاف نہیں ہے": وہ "یاأیھاالذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما أحل الله لکم" (مائدہ:۸۷) کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ذائقہ دار کھانے اور جائز لذتوں کو حرام کرلیا تھا (فتح الباری: کتاب الاطعمۃ)۔

انسان جن چیزوں کو کھاتا اور پیتا ہے اور بطور غذا اور دوا کے استعمال کرتا ہے، اس کے مزاج اور اس سے صادر ہونے والی حرکات وسکنات کی تشکیل میں ان کا بڑا اثر ہوتا ہے، حافظ ابو الفداء اسماعیل بن کثیرؒ قرآن کی اس آیت کے بارے میں اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں:"یا أیھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا إني بما تعملون علیم "اس میں اللہ تعالی اپنے بندوں کو اس بات کا حکم دے رہا ہے کہ وہ حلال رزق کھائیں اور نیک اعمال کریں۔ اس سے اس بات کا پتہ چلا کہ حلال رزق عمل صالح میں معاون ہوتا ہے، اور تمام انبیاء نے اس حکم کو مکمل طور پر انجام دیا اور انہوں نے اپنے قول وعمل، رہنمائی اور خیر خواہی کے ذریعہ بیک وقت ہر خیر کو انجام دیا، اللہ ان کو تمام بندوں کی جانب سے بہتر بدلہ عطا فرمائے (تفسیر ابن کثیر)۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ہر نبی نے بکری چَرائی، لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ؟ آپؐ نے فرمایا: میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں چرائی ہیں، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے، اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم اپنی والدہ کے سوت کاتنے کی مزدوری سے کھاتے تھے (تفسیر ابن کثیر.)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی ذات پاک ہے اور وہ پاکیزہ چیزوں کو ہی قبول کرتا ہے، اور اللہ نے مؤمنین کو بھی اسی چیز کا حکم دیا ہے جس کا حکم رسولوں کو دیا ہے، ارشاد ربانی ہے" یا أیھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً إني بما تعملون علیم "(المؤمنون:۵۱) ترجمہ:"اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک اعمال کرو، جو کچھ تم کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں"، دوسری جگہ ارشاد ہے: یا أیھا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم (البقرۃ: ۱۷۲)" اے ایمان والو! میرے عطا کردہ پاک رزق میں سے کھاؤ" پھر اس شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر پر ہو، پراگندہ حال اور غبار آلود ہو، وہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے، اے میرے رب! اے رب! اس حال میں کہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام اور اس کا لباس حرام اور اسکی غذا بھی حرام ہوتی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔

امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے تو نبیوں اور مؤمنین سے حلال کے استعمال اور حرام سے اجتناب کے سلسلہ میں یکساں خطاب کیا ہے، پھر اس وعید میں ہر شخص کو شامل کیا جو اللہ تبارک وتعالی کے اس قول میں ہے"إني بما تعملون علیم "ترجمہ: جو کچھ تم کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں"، اللہ کے رسولوں اور انبیاء پر درود وسلام ہو۔ (الجامع لأحکام القرآن، سورہ مؤمنون:۵۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی بدنی اور روحانی دونوں بنیادیں ناپاک اور حرام غذا سے متاثر ہوتی ہیں، جو دین ودنیا میں راہِ حق اور سیدھے راستہ سے بھٹکنے میں اضافہ کرتی ہیں، اور اللہ تبارک وتعالی کی مرضیات سے دوری اور خواہش نفس کی

پیروی کی زیادتی کا سبب بنتی ہیں، اور اسی طرح وہ اخلاق وعادات اور اعمال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات پاک اور حلال غذا کی ترغیب، ناپاک شئی اور حرام غذا کی ممانعت سے بھری پڑی ہیں، کیونکہ ناپاک شئی وبری غذا کا کھانا بہت سے روحانی وجسمانی امراض کا سبب بنتا ہے، مگر بعض امراض اور تکلیف دہ وہ چیزیں ہیں، جن میں اللہ کی جانب سے اس کے نیک اور دوسرے بندوں کی آزمائش ہوتی ہے تاکہ ان کے گناہوں کو مٹانے اور ان کے رفع درجات کا سبب بنے۔ یہ چیز دنیا میں آبادئ انسان تک باقی رہے گی۔

حلال اور حرام حیوانات:

اللہ تبارک وتعالی نے ابن آدم کو عزت بخشی، اور اسکے لئے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا جو زمین وآسمان میں ہیں اور حیوانوں اور پرندوں کو بھی اسی کیلئے پیدا کیا، ان میں سے بعض کو حلال کیا اور بعض کو انکی کراہت کی وجہ سے یا فوری طور پر کوئی صفت پائے جانے کی وجہ سے حرام کیا، بعض حیوان خشکی اور پانی میں رہتے ہیں، اسلئے فقہاء کے درمیان ان کی حرمت اور حلت کے سلسلہ میں اختلاف ہے اور اسمیں ہر ایک کی اپنی دلیلیں ہیں، جن کے ذریعہ وہ استدلال کرتے ہیں جن میں سے کسی کے استدلال کا انکار نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنی رائے میں درست ہے، لیکن اس سلسلے میں احناف کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے، اور کھانے کے سلسلہ میں آپ ؐ کے عمل سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ احناف کے نزدیک پانی میں رہنے والے جانوروں میں مچھلی کے علاوہ کچھ بھی حلال نہیں ہے، اور اس سلسلہ میں امام شافعیؒ کے تین اقوال ہیں:

(۱) پانی میں رہنے والے تمام حیوان حلال ہیں۔

(۲) مچھلی کے علاوہ پانی میں رہنے والے تمام حیوان حرام ہیں۔

(۳) خشکی میں رہنے والا جو بھی حیوان حلال ہے، اسی جنس کا پانی میں رہنے والا جانور بھی حلال ہے، اور اسی طرح جو برّی جانور حرام ہیں تو اسی جنس کے پانی میں رہنے والے جانور بھی حرام ہیں، البتہ قول اول ان کے نزدیک راجح ہے۔ (المجموع شرح المذہب، کتاب الاطعمۃ: ج۹/ص۳۰/۳۲-۳۲)

اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مینڈک کے علاوہ پانی میں رہنے والے تمام جانور حلال ہیں (المغنی، کتاب الجزیۃ، فصل فی حکم مالایعیش الا فی الماء: ج۱۱/ص۸۵،)، اور امام مالکؒ نے نزدیک پانی میں رہنے والے تمام جانور سوائے بحری خنزیر کے حلال ہیں، کیونکہ وہ پانی میں رہنے کی وجہ سے انکے نزدیک مکروہ کا درجہ رکھتا ہے۔ (المیز ان الکبری، کتاب الاطعمۃ، ج۳/ص۱۱)

جہاں تک خشکی میں رہنے والے جانوروں کی بات ہے تو اسمیں فقہاء کے درمیان قدرے اختلاف ہے، چنانچہ وہ جانور جن میں مطلق خون نہیں پایا جاتا ہے جیسا کہ ٹڈی، مکھی، مکڑی، بھڑ اور اسی طرح کے دیگر جانور، سوائے ٹڈی کے بالاتفاق فقہاء کے نزدیک حرام ہیں، جہاں تک ان جانوروں کی بات ہے جن میں دم سائل نہیں پایا جاتا ہے، جیسا کہ سانپ، زمینی کیڑے اور اس طرح کے جانور تو یہ بھی باتفاق علماء حرام ہیں سوائے گوہ کے کہ وہ امام شافعیؒ اور بعض فقہاء کے نزدیک حلال ہے، اور اس کے علاوہ وہ جانور جن میں بہنے والا خون ہو تو وحشی ہوگا یا پالتو، چنانچہ وحشی جانور جسمیں ہرن کے بچے، گائے، وحشی اونٹ اور اونٹنیاں ہیں،، اور پالتو جانوروں میں اونٹ، گائے، بیل، بھینس، بکری اور بکرا وغیرہ ہیں، اور اسی طرح خرگوش یہ تمام کے تمام بالاتفاق حلال ہیں، اور پالتو کتا بلی اور اسی طرح گدھا خچر اور دیگر وحشی درندے شیر بھیڑیا اور بندر نیز اس طرح کے جانور بالاجماع حرام ہیں۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: بدائع

الصنائع والفتاوی الہندیۃ وغیر ذلک من الکتب الفقیۃ) اس سلسلے میں اصل دلیل وہ ہے جو عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس جانور سے منع فرمایا جو درندے کے قائم مقام ہو، اور ہر اس پرندے سے بھی جو پنجہ والا ہو۔(الصحیح لمسلم: حدیث/۴۹۹۶،)

اور بعض بڑے حیوانات جن کے حلال وحرام اور مکروہ ہونے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، اور وہ جانور لومڑی، گیدڑ، پالتو گدھا، گھوڑا، اور چارہ خور چوہا ہے، اسی طرح پلید کھانے والی گائے اور جانور کا وہ بچہ جو اپنی مذبوحہ ماں کے پیٹ میں مرجائے اور اپنی ماں کے ذبح ہونے کے بعد مردہ نکل آئے، اور اسی طرح پرندوں میں مرغا، بطخ، جنگلی کبوتر اور فاختہ کے مانند ایک مشہور پرندہ (قماری) کبوتر اور ایک قسم کا آبی پرندہ جو سارس کے مشابہ ہوتا ہے، صفاریہ (زرد پروں کا پرندہ) ایک چھوٹا پرندہ اور گوریئے نیز اسی جیسے پرندے باتفاق علماء حرام ہیں، اور اسی قبیل کے مزید پرندے جنمیں چیل، گدھ، شکرے، عقبان (قوی شکاری پرندہ) اور ہدہد ہیں، سب بالاجماع حرام ہیں، ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں جنمیں فقہاء کا اختلاف ہے۔(یراجع کتب الفقہ)

فی نفسہ حرام چیزیں:

قرآن کریم نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ تم پر مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حرام کر دیا گیا، اور اس جانور کا گوشت جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، اور وہ جانور جو گلا گھٹنے سے مرگیا ہو، اور جو اوپر سے گر کر مرگیا ہو، یا وہ جسے کسی جانور نے سینگھ مار کر ہلاک کر دیا ہو، اور وہ جسے درندے نے کھالیا ہو، الا یہ کہ تم اس کو مرنے سے پہلے ذبح کر چکے ہو، یا وہ جانور جو بتوں کے سامنے اکھاڑے پر ذبح کئے گئے ہوں۔(المائدۃ:۳)

میت:۔ ہر حلال جانور جس کو غیر شرعی طور پر ذبح کرنے سے روح نکل جائے وہ بالاجماع حرام ہے سوائے مچھلی اور ٹڈی کے، لیکن مردار کا بال اور اس کا اون اور اسکی ہڈی پاک ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے، اسی طرح چمڑے سے بھی دباغت کے بعد فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

خون:۔ یہاں اس سے مراد بہنے والا خون ہے، دوسری آیت کی روشنی میں جس میں وارد ہے: ''کہہ دیجئے کہ مجھ پر جو وحی آتی ہے اس میں کسی کھانے والے کیلئے کوئی چیز حرام نہیں پاتا ہوں جسکو وہ کھائے، الا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون، یا خنزیر کا گوشت ہو، بلا شبہ وہ گندگی ہے، یا گناہ اور شرک کا سبب بنا ہو، کوئی ایسا جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' (الانعام: ۱۴۵)، اسی طرح بہتا ہوا خون بھی حرام ہے، اور جو خون گوشت میں جم گیا ہو تو وہ گوشت کیطرح ہو گیا، اسلئے وہ حلال ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، مردار سے مراد: مچھلی اور ٹڈی ہے، اور دو خون سے مراد: کلیجی اور تلی (مسند احمد وسنن ابن ماجہ والسنن للدار قطنی.)۔

خنزیر:۔ جمہور علماء کے نزدیک وہ بذات خود، مطلق حرام ہے، اس کے کسی حصے کا کھانا خواہ گوشت ہو یا خون یا چربی یا اور کوئی دوسرا حصہ قطعاً حلال نہیں ہے۔

اور جس چیز پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو:

ہو:۔ اس سے مراد وہ حیوان جس کو غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا گیا ہو جو حرام ہے۔

المنخنقۃ:۔ وہ جانور جو قصداً یا اتفاقاً گلا گھٹنے سے مر جائیں۔(تفسیر ابن کثیر.)

وہ حیوان جسے لاٹھی یا پتھر یا کسی غیر محدود بوجھل چیز سے مارا گیا ہو، یہاں تک کہ وہ بغیر ذبح کئے مرجائے یہ بھی حرام ہے۔

المتردية :۔اسی طرح وہ جانور جو بلندی سے گر جائے یا کنویں یا گڑھے میں گر کر بغیر ذبح کئے مر جائے، تو وہ حرام ہے۔

النطيحة:۔اور جو جانور کسی دوسرے کے سینگھ مارنے کے سبب ذبح کئے بغیر مر جائے۔

وما أكل السبع :۔اور وہ حیوان جس پر درندہ حملہ کرے اور وہ بغیر ذبح کئے مر جائے جیسا کہ شیر چیتا، تیندوا وغیرہ۔

وہ جانور جس کو بتوں کے پاس ذبح کیا جائے :۔یعنی کعبہ کے اردگرد ایک پتھر نصب کیا ہوا تھا، زمانۂ جاہلیت میں اھل عرب اس کے سامنے اپنے جانوروں کو ذبح کرتے تھے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کیا اور اس ذبیحہ کو جنہیں بتوں کے پاس ذبح کیا جاتا تھا ان کا کھانا حرام کر دیا، اگر چہ ان بتوں کے پاس ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو، وہ سب شرک ہے، جن کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، اور مناسب یہ ہیکہ اس مسئلہ کو بھی مذکورہ مسئلہ پر محمول کیا جائے، اسلئے کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کی حرمت گزر چکی ہے (تفسیر ابن کثیر)، اور اس حیوان کو بھی اسی مسئلہ پر محمول کیا جائے جو اولیاء وصلحاء کی قبر پر انکی تعظیم وتکریم میں ذبح کیا گیا ہو، یا انکے نام سے آزاد کیا گیا ہو۔

اسی طرح خونخوار چوپائے، پرندے اور زمین کے کیڑے نیز وہ جانور جن کے اندر کراہت اور گندگی پائی جاتی ہو اور ان کی حرمت سنت نبوی ﷺ سے ثابت بھی ہو، وہ سب حرام ہیں۔

جانوروں کے ذبح کرنے کا طریقہ اور اس کے آلات : ہر حلال جانور کا گوشت کھانا اسی وقت جائز اور درست ہوگا جب کہ شرعی احکام کے مطابق ذبح کیا گیا ہو، اسلامی شریعت نے اس کیلئے کچھ قاعدے اور اصول مقرر کئے ہیں، جس کے بغیر وہ حلال نہیں ہوتا ہے، ہمارے لئے یہ بہت مناسب موقع ہے کہ ہم اسلامک فقہ اکیڈمی کے ان فیصلوں کا مکمل طور پر حوالہ دیں جو علماء کے مابین بحث وتحقیق کے بعد کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں شائع کئے گئے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مبحث اول: ذبح کی قسمیں اور اسکی جدید صورتیں:

ذبح:۔لغت میں پھاڑنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں ان جانوروں کے حلقوم، شہہ رگ اور دیگر دو رگوں کے کاٹنے یا ان میں سے اکثر رگوں کے کاٹنے کو کہتے ہیں جن جانوروں پر قدرت ہو، اور غیر مقدور جانوروں کے جسم میں کسی بھی جگہ زخم کرنے کا نام ذبح ہے۔

ذبح کرنے کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری دوسری اضطراری:

ذبح اختیاری :۔چار رگوں کے کاٹنے کا نام ہے جنمیں حلقوم، شہہ رگ اور دیگر دو رگیں ہیں، یا ان چاروں رگوں میں سے اکثر رگیں کٹ جائیں، یہ حکم ان جانوروں میں نافذ ہوگا جن پر ذبح کے وقت قدرت حاصل ہو۔

ذبح اضطراری: یہ ہے کہ جانوروں کے جسم کے کسی حصہ میں نشانہ لگایا جائے، اور حکم اضطراری کا اعتبار ان جانوروں میں ہوگا جن پر ذابح قدرت نہ رکھتا ہو، اور ذبح اضطراری کی صورت عام طور پر جنگلی جانوروں میں پائی جاتی ہے، لیکن ان جانوروں میں اس کا اطلاق نہیں ہوگا جن کے ذبح کرنے پر انسان زندہ حالت میں قدرت رکھتا ہو۔

چند مشترکہ شروط جو ذبح کی دونوں قسموں میں مساوی ہیں:

(۱) ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی ہو۔

(۲)ذبح کرنے والا عاقل ہو۔
(۳)ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے۔
(۴)اللہ کے نام کے ساتھ غیر اللہ کا نام نہ لے۔
(۵)ذبح کرتے وقت جانور زندہ ہو ۔
(۶)اسکی روح ذبح کرنے سے ہی نکلی ہو۔
(۷)ذبح کا آلہ دھاردار اور تیز ہو۔

اختیاری ذبح کی خاص شرطیں

(۱)معین مذبوح پر بسم اللہ پڑھنا۔
(۲)متعین رگوں کا کاٹنا۔
(۳)بسم اللہ اور ذبح کرنے کے درمیان زیادہ فصل نہ کرنا۔

ذبح اضطراری کی اہم شرطیں

(۱)شکار کرنے والا محرم نہ ہو۔
(۲)جانور حرم کے شکار میں سے نہ ہو۔
(۳)جانور یا پرندہ ٹریننگ یافتہ نہ ہو۔
(۴)شکار پر گولی چلاتے یا تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھے۔
(۵)ذبح اختیاری ذبح اضطراری کی جگہ میں حلال ہے، اور ذبح اضطراری ذبح اختیاری کی جگہ میں جائز نہیں ہے۔

مبحث دوم:

(۱)ذبح کرنے والے کیلئے شرط ہے کہ عاقل ہو اور بالغ، مسلمان یا کتابی ہو، اور اگر بچہ ہو تو باشعور ہونا ضروری ہے۔
(۲)فقہاء کے نزدیک کتابی سے مراد ہر وہ آدمی ہے جو کسی ایسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتا ہو جسکی قرآن مجید نے تصدیق کردی ہے، لہذا اس وقت یہود و نصاری مراد ہوں گے۔
(۳)آج کے دور میں یہود و نصاری کتابی شمار کئے جاتے ہیں، انکا ذبیحہ حلال ہے مگر یہ کہ یقین ہو جائے کہ وہ اللہ کا منکر و ملحد نہ ہو۔
(۴)قادیانی کا ذبیحہ جائز نہیں ہے اگر وہ اپنے آپکو احمدی یا لاھوری شمار کرتا ہو۔
(۵)ذبح کیلئے شرعی حقیقت کا وجود لازم ہے خواہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا کتابی ہو ۔ ہر وہ صورت جس میں جانور ڈائرکٹ یا کسی مشین کے ذریعہ مار دیا جائے یا خود مر جائے اس طرح سے اسکا اعتبار ذبح شرعی میں کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے مرنے والے جانور کا نام ذبیحہ نہیں رکھا جائے گا اور نہ ہی وہ حلال ہوگا، مثال کے طور پر اگر گولی یا چھرے سے اس جانور پر قدرت پانا ممکن ہو، یا بجلی کے کسی آلہ سے ذبح کا کام لیا گیا ہو، یا جانور کے جسم کی کسی جگہ کو زخمی کر کے خون نکالا گیا ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو، ان مذکورہ بالا ساری صورتوں کو ذبح شرعی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مبحث سوم:

(۱)شریعت کے مطابق جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری سمجھا جاتا ہے ، کیوں کہ جب جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔

جب جانور کو بغیر اللہ کا نام لئے ہوئے ذبح کر دیا جائے تو ایسی صورت میں دو چیزیں ہوں گی، یا تو اس نے قصداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہوگا، یا بھول گیا ہوگا، اگر جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول جائے تو یہ ذبح شدہ جانور حلال ہوگا، اور جب جان بوجھ کر چھوڑ دے تو جمہور کے نزدیک اس ذبیحہ کو کھانا جائز نہیں ہوگا۔

لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر تسمیہ معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا جائے تو ذبح شدہ جانور حلال نہیں ہوگا، اور اگر معمولی سمجھ کر نہ چھوڑا جائے بلکہ تسمیہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے تو ایسی صورت میں ذبح کیا گیا جانور حلال ہوگا، کیونکہ تسمیہ کا پڑھنا ان کے نزدیک سنت ہے، البتہ یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری

ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک تسمیہ پڑھنا واجب ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے، اور ان دونوں حالتوں میں حکم برابر ہوگا خواہ تسمیہ واجب ہو یا سنت، اسلئے کہ ہر مسلمان یہی گمان کرتا ہے کہ جو شخص جانور کو ذبح کرے اور تسمیہ کو جان بوجھ کر نہ چھوڑے، تو ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کیلئے حلال ہو جائے گا، ہمیں اس بات کی تحقیق کئے بغیر نہیں کھانا چاہئے کہ کیا اس نے تسمیہ جان بوجھ کر چھوڑا تھا، یا بھول گیا تھا، اس لئے کہ ہر مسلمان جانور کے حلال ہونے کے سلسلہ میں اس دعا کا پڑھنا ضروری سمجھتا ہے۔

(۲) جانور کو ذبح کرنے کے وقت تسمیہ پڑھنا واجب ہے اور اگر عمل متعدد ہو جائے تو تسمیہ بھی متعدد ہو جائے گا اور اگر عمل ایک ہی ہو تو ایک ہی مرتبہ تسمیہ پڑھنا کافی ہو جائے گا، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ''جانور کو تسمیہ پڑھنے کے بعد ذبح کرے'' لیکن وہ ابھی مکمل طریقہ سے ذبح نہیں ہوا تھا کہ وہ بھاگ گیا، پھر جب دوسری مرتبہ چھری چلانے کیوجہ سے کئی جانور ذبح ہو گئے تو ایسی صورت میں ایک ہی مرتبہ تسمیہ کا پڑھنا کافی ہوگا، ذبح اختیاری کی صورت میں ذبح کئے جانے والے جانور کا معلوم اور متعین ہونا ذبح کرنے کے وقت واجب ہے، یا کچھ جانوروں کو متعین کر لے لیکن اس کی جگہ دوسرے جانوروں کو ذبح کرے تو تمام کے تمام جانور حرام ہو جائیں گے۔

(۳) کبھی کبھی جانور کے ذبح کرنے کے وقت لوگ باہم شریک ہو کر ذبح کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر دو آدمیوں نے چھری مٹھی سے پکڑی، یا ایک کمزور شخص نے اس کو پکڑا اور اس کے ہاتھ کے اوپر ایک دوسرے شخص کا ہاتھ ہو تو ایسی صورت میں دونوں آدمیوں پر تسمیہ پڑھنا واجب ہوگا، ذبح کرنے والے کا متعین ہونا ضروری ہے، اور ذبح کرنے میں سر پیر اور ہاتھ پکڑنے والے کا متعین ہونا ضروری نہیں ہے۔

مبحث رابع :

عام طور پر جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے کرنٹ شوٹ یا کسی دوسری چیزوں کے ذریعہ سون کر دیا جاتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ اس سے جانور کی تکلیف اور پریشانی کم ہوتی ہے لیکن اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس کو پسند نہیں کیا ہے، اس لئے جانور کو بغیر سون کئے ہوئے ذبح کرنا بہتر ہے، لیکن کسی علاقہ میں جانور سون کر کے عام طور سے ذبح کیا جاتا ہو، اور اس بات کا پورا یقین ہو کہ بجلی کے شاٹ کے ذریعہ جانور کو سن کرنے کیلئے جب شاٹ لگائیں گے تو جانور صرف بیہوش ہوگا اور وہ مرے گا نہیں، تو جب جانور کو کرنٹ (شاٹ) لگائے، اور اس پر بیہوشی طاری ہو جائے اور وہ مرے نہ، تو جانور کو ذبح کر کے کھانا جائز ہوگا (التزکیۃ وصورھا وأنواعھا فی الشریعۃ الاسلامیۃ: ۲۵۰۔۲۰۰)۔

ذبح کئے ہوئے جانور کے حرام اعضاء

اسلامی شریعت میں حلال جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کے سارے اعضاء کو کھانا جائز نہیں ہے، بلکہ کچھ اعضاء ایسے بھی ہیں جو انسان کے بدن کو نقصان پہونچاتے ہیں اور وہ حرام بھی ہیں، چاہے وہ فطری طور پر حرام ہوں جیسے لید اور گوبر، یا فطری طور پر حلال ہوں جیسے بال وغیرہ، اور مجاہد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بکری کی سات چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے: پت، پیشاب کی تھیلی، وہ گوشت جو کسی بیماری کیوجہ سے ابھر آیا ہو، شرم گاہ، ذکر، خون اور دودھ کی تھیلی (کتاب الآثار للامام محمد: ۷۷۷)۔ اس لئے یہ تمام اجزاء حلال جانور کے حرام کر دئے گئے ہیں (بدائع الصنائع: ۶۱/۵)، اسی طرح ہر اس عضو کا کھانا حرام ہے جو جانور کے زندہ رہنے کی حالت میں علیحدہ ہو گیا

ہو، یا کاٹ دیا گیا ہو، چنانچہ ابو واقد اللیثیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ آئے تو کچھ لوگوں کو دیکھا جو بکری کی گردن اور اونٹ کے کوہان کو کاٹنا چاہ رہے تھے، تو ارشاد فرمایا: کہ کسی جانور کا کوئی عضو اگر اسکی زندگی میں ہی کاٹ دیا ہو تو اس عضو کا کھانا حلال نہیں ہوگا (السنن الکبری للبیھقی: حدیث: ۷۸)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث کی روشنی میں سارے ائمہ اور فقہائے کا اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں گوشت کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔

نباتاتی غذائیں

زمین سے جو بھی چیز نکلتی ہے یعنی پھل، پودے، گھاس، فصلیں اور میوے ان میں کوئی ممنوع نہیں ہے مگر جب یہ عقل اور بدن کے نقصان کا باعث ہوں تو ممنوع ہیں، جیسا کہ جمادات میں سے جو بھی چیز عقل اور صحت کے نقصان کا سبب ہو مثلاً مٹی، پتھر، کوئلہ، شیشہ، لوہا اور اس طرح کی تمام چیزیں حرام ہیں، اسی نقصان کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ حصکفیؒ نے کہا ہے کہ گھاس پوس بھانگ وافیم کا کھانا حرام ہے، اسلئے کہ یہ عقل کو بگاڑ دیتی ہیں اور اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دیتی ہیں (الدر المختار مع رد المختار کتاب الأشربۃ ۲۸/۱۰)۔

اور یہی حکم دھتورہ کا بھی ہے، اس لئے کہ یہ نشیلی اشیاء میں شمار کیا جاتا ہے، اور جہاں تک تمباکو، سگریٹ، اور حقہ کی بات ہے تو یہ بھی کراہت سے خالی نہیں ہیں، بعض علماء نے تو ان کو حرام قرار دیا ہے، آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ہر نشہ آور اور عقل کو مدہوش کر دینے والی شئی سے روکا ہے، اور مضر سے مراد جو جسم کو نقصان پہونچاتا ہو اور اس کو کمزور کر دیتا ہو، اگر چہ اسکے اندر نشہ نہ ہو (رد المختار: کتاب الأشربۃ: ۴۱/۱۰)۔

بہر حال ان گھاس و پودے کے علاوہ ہر گھاس و پودے حلال ہیں اور جو پاک چیزیں ہمارے لئے حلال ہیں اگر چہ جوس یا شربت کی شکل میں ہوں، مگر جب اس کے اندر نشہ آجائے تو نشہ کی وجہ سے حرام ہو جائیں گی، نہ کہ اپنی ذات کی وجہ سے۔

نشیلی اور عقل کو متاثر کرنے والی اشیاء:

کوئی شک نہیں کہ اسلامی شریعت کے جملہ مقاصد میں عقل انسانی کی حفاظت بھی شامل ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے اسی وجہ سے انسان کو فضیلت دی ہے، اور اسی بنا پر اس کو تمام حیوانات سے ممتاز بنایا ہے، اور اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اسی لئے ان کو پابند بھی بنایا ہے، چنانچہ عقل بہت بڑی دولت اور بیش بہا نعمت ہے، اسی کے ذریعہ انسان دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کرتا ہے اور ان کے نقصان کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہی دنیا و آخرت کا ذخیرہ ہے، جیسا کہ صحیح غذا اور صحیح فکر کے ذریعہ انسان پر اپنی عقل کی حفاظت و نگہداشت اور اس کو فروغ دینا ضروری ہے، اسی طرح اس پر یہ بھی واجب ہے کہ اس کی ہر اس چیز سے حفاظت کرے جو اس کو بگاڑنے والی ہے یا نقصان پہنچانے والی ہو، بلا شبہ نشیلی اشیاء اور شراب سے انسان عقل و شعور کھو دیتا ہے، بلکہ اس کا پینے والا شعور و بیداری سے عاری ہو جاتا ہے، اور جس کی وجہ سے ایسی حرکتیں اور ایسے نازیبا اعمال اس سے سرزد ہوتے ہیں جن کا صدور حالت بیداری میں ناممکن ہوتا ہے، جیسا کہ ایک عالم نے کہا ہے کہ ان کا گزر ایک مدہوش آدمی کے پاس سے ہوا، وہ اس حال میں تھا کہ اپنے ہاتھ میں پیشاب کر رہا تھا اور متوضی کی طرح اس سے اپنے چہرہ دھو رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا: **الحمد لله الذی جعل الاسلام نوراً و الماء طهوراً** (۲۸)۔

بسا اوقات مدہوش آدمی دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے

بلکہ اپنے اعزہ واقارب پر بھی ظلم کر ڈالتا ہے، اللہ تعالی نے اپنے اس قول میں مذکورہ بالا صورتوں کو یکجا کر کے واضح فرمادیا ہے ’’**إنما يريد الشيطان أن يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر ويصدكم عن ذكر الله وعن الصلاة**‘‘ (مائدۃ۹۱) ترجمہ: ’’بلاشبہ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب وجوئے کے ذریعہ عداوت ودشمنی پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر سے روک دے‘‘، یہ فساد عقل کے ساتھ جسم وصحت کو بھی بگاڑ دیتا ہے، جس کی وجہ سے انسان جانور کی مانند ہو جاتا ہے، امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ انسان کی عقل اس کی تمام صفات میں نمایاں صفت ہے، اور شراب عقل کی دشمن ہے، اور ہر وہ چیز جو اچھی چیزوں کی دشمن ہو، وہ غیر معقول ہے، اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ شراب نوشی انتہائی گھٹیا عمل ہے (المرجع نفسہ: ۳۲۰/۲)

اور حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا تھا کہ شراب مال کو ہلاک کر دیتی ہے اور عقل کو زائل کر دیتی ہے (بحر العلوم للسمرقندی: ۲/) اور اللہ کے رسول ﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے (دلائل النبوۃ للبیہقی: رقم ۱۹۹۴)، لہذا شراب اور اس کے دائرے میں جو بھی نشیلی چیزیں ہیں خواہ پھل سے نچوڑی گئی ہوں یا درخت سے یا انگور سے یا کھجور سے، خواہ تھوڑی ہوں یا زیادہ چاہے اس کے پینے سے نشہ آتا ہو یا نہ آتا ہو، چاہے اسکو مسکر گردانا جاتا ہو یا کسی دوسرے نام سے، ہر حالت میں وہ حرام سمجھی جائیں گی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر نشہ آور چیز شراب ہے (سنن الترمذی: رقم ۱۸۶۱/)۔

اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور یہاں پر بہت ساری پینے والی چیزیں جس میں نشہ پایا جاتا ہے پینے والے کے تاثر کو دیکھے بغیر اور اس کی مقدار کو دیکھے بغیر اس کا پینا حرام قرار دیا جاتا ہے اگر چہ اس کا نام کچھ اور ہو، نیز اللہ کے رسول ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’ہر وہ چیز جس میں نشہ تھوڑا ہو یا زیادہ سب حرام ہے۔‘‘ (سنن الترمذی: رقم ۱۸۶۵/)

اور بے ہوش کر دینے والی چیزیں جس سے عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ جو گھاس یا دیگر نباتات سے بنائے جاتے ہیں مثلا: سوکھی گھاس اور کوکین اسی طرح بہت ساری نشہ آور چیزیں جن کا شمار ناممکن ہے اور جو اہل تجربہ کی تحقیق پر موقوف ہیں اور وہ زیادہ تعداد میں لوگوں کے درمیان عام ہیں، اور اسی طرح بہت ساری نشہ آور چیزیں جو کیمیکل کے ذریعہ کبھی وہ ٹیبلٹ یا کیپسول کی شکل میں ہوتی ہیں اور کبھی بشکل سیال اور کبھی منہ کے راستہ سے استعمال کی جاتی ہیں اور کبھی حقہ کے ذریعہ لی جاتی ہیں، لہذا عقل کو مدہوش کرنے والی اور دیگر ساری نشیلی چیزیں جنکو شریعت نے حرام قرار دیا ہے ان کو حرام صرف عقل کی حفاظت کیلئے نہیں، بلکہ عقل، جسم، افراد، جماعت اور پوری ملت کی حفاظت کیلئے قرار دیا ہے، اسلئے کہ اس کا نقصان صرف پینے والے کی عقل وجسم اور اس کے مال وخاندان کو نہیں، بلکہ ہر اس شخص وجماعت کو لاحق ہوتا ہے جو اسکے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور ساتھ رہتا ہے اور اسکی طرف منسوب ہوتا ہے۔ (جاری)

☆☆☆

تجزیہ

ایک بصیرت افروز تجزیہ

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

شیخ محمد الحائک مصری نیوجرسی کے ایک بڑے اسلامک سینٹر میں امام وخطیب تھے۔ شیخ محمد الحائک نے اپنے استاد شیخ عبدالحلیم محمود (سابق شیخ الازہر جو امام غزالی کے علوم کے بڑے ماہر تھے، ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی میں بھی شرکت فرمائی تھی) کا ایک بصیرت افروز تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن میرے استاذ (شیخ عبدالحلیم محمودؒ) نے دوران درس ہم طلباء سے سوال کیا، عزیز طلبہ آج کل تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اخبارات میں اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ اسلام افریقہ میں اپنی کشش اور کمال کی وجہ سے پھیل رہا ہے، اس طرح کی خبریں پڑھ کر آپ لوگوں پر کیا تأثر ہوتا ہے؟ طلبہ نے عرض کیا، ہم لوگوں کو غیر معمولی خوشی ہوتی ہے، ایسی خبریں پڑھ کر ہم لوگ بے پناہ مسرور ہوتے ہیں۔

شیخ نے فرمایا: ''عزیزو اس طرح کی خبریں مسلمانوں کو سلانے اور انہیں غافل کرنے کے لئے دی جاتی ہیں تاکہ مسلمانوں کا یہ ذہن بنے کہ ہمیں اسلام کی دعوت و اشاعت کے لئے کسی خاص محنت اور کوشش کی ضرورت نہیں ہے، اسلام تو خود اپنی خوبیوں کی وجہ سے تیزی سے پھیل رہا ہے، اس طرح کی چیزیں چھاپ کر ہمیں سلایا جا رہا ہے اور عیسائی مشنریاں بڑی خاموشی اور تیزی کے ساتھ افریقی ممالک میں اپنا دعوتی اور رفاہی کام کر رہی ہیں، لوگ کثرت سے عیسائیت کی گود میں جا رہے ہیں، اگر ہماری غفلت اور ان کی چاپلوسی کا یہی حال رہا تو مجھے خطرہ ہے کہ بہت سے افریقی ممالک میں آبادی کا تناسب بدل جائے گا، جن ممالک میں عیسائی بڑی اقلیت ہیں وہاں وہ اکثریت میں آجائیں گے اور جہاں برائے نام اقلیت ہیں وہاں طاقت ور اقلیت بن جائیں گے۔

ہم طلباء کو اس وقت تو استاذ محترم کا انتباہ سمجھ میں نہیں آیا لیکن چند ہی سال کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ آبادی کا تناسب تیزی سے تبدیل ہوا ہے اور عیسائیوں کی آبادی اکثر افریقی ملکوں میں بڑھ رہی ہے۔

اس بصیرت افروز تجزیہ کو سرسری طور پر پڑھ کر گزر جانا یہ

سراسر ہماری بے حسی اور حقائق سے چشم پوشی و بے غیرتی ہوگی، بلکہ بحیثیت امتِ دعوت ہماری اہم ترین ذمہ داری ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں، دشمن کے نشانے اور حربے سے واقف ہوں، توحید کی امانت سارے انسانوں تک پہنچانا، خیر وصلاح کی طرف بلانا، بھلائیوں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا، اللہ کے راستے کی طرف انسانیت کی رہنمائی کرنا اور شیطان کے راستے سے باز رکھنا ہمارا فرضِ منصبی ہے۔ مسلمانوں کو الحاد وارتداد کے سیلاب سے بچانا، انہیں فقر وافلاس سے نکالنا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہ حقیقت ہماری نگاہ سے اوجھل نہ رہے کہ یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں نتائج کوشش اور محنت سے جوڑ دیئے گئے ہیں۔ کوئی بھی مذہب اور فلسفہ خواہ وہ باطل اور انتہائی کمزور اور بودا ہی کیوں نہ ہو اگر اس کے لیے جدو جہد اور محنت وکوشش کی جائے تو اسے قبول کرنے والے اور اپنانے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مل جاتے ہیں، اور اس کے برعکس کوئی مذہب اور نظریہ خواہ کتنا ہی سچا، حق اور مبنی برصداقت ہو اگر اس مذہب اور نظریہ کے لئے دعوت واشاعت کی محنت نہ کی جائے تو اس کو فروغ نہیں ملتا۔

عیسائی مبلغین اور عیسائی مشنریاں پوری دنیا میں انتھک محنت کر رہے ہیں اور عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے مکمل منصوبہ بندی اور تسلسل کے ساتھ تمام ممکنہ وسائل وذرائع کا استعمال کر رہے ہیں، ان کی کوششوں کا نتیجہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، آج صورت یہ ہے کہ اکثر مما لک میں ان کی اکثریت ہو چکی ہے۔ اور جن مما لک میں ان کی آبادی صفر تھی وہاں بھی ان کی تعداد اچھی خاصی ہوگئی ہے، خود ہمارے ملک میں بہت سے صوبے ایسے ہیں جہاں آج عیسائی اکثریت میں ہیں اور وہ علاقے عیسائی اکثریت کے علاقے بن چکے ہیں۔ آج ہندوستان میں گوا، سکّم اور ناگالینڈ میں عیسائی کس تعداد میں ہیں، کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔ عیسائیوں کے برعکس ہم مسلمانوں کی دعوتی کوششیں صفر ہیں، حد یہ ہے کہ ہماری دعوتی فتوحات کا دائرہ سمٹتا ہی جا رہا ہے۔ دعوت کے میدان میں ہم نئے میدان فتح کرنے کے بجائے اپنے پرانے مفتوحہ علاقوں کو بھی گنواتے جا رہے ہیں اور نوبت ایں جا رسد کہ خالص مسلم مما لک میں بھی عیسائی مبلغ سرگرم عمل ہیں۔

خلیجی مما لک مصر وترکی، افغانسان اور برصغیر کے تمام مما لک میں وہ اپنے مقصد اور مشن میں کافی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور ان مما لک میں کتنے مسلمان عیسائیت کی گود میں جا چکے ہیں، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کا مسلم اکثریتی صوبہ کشمیر بھی عیسائی مشنریز کا ایک بڑا مرکز ہے اور وہاں عیسائی مشنریز بہت سرگرم ہیں، رفاہ عام اور خدمت خلق کے ذریعہ مشنریز مسلمانوں کو اپنا شکار بنا رہی ہیں اور انہیں باقاعدہ عیسائیت میں داخل کر رہی ہیں۔ کشمیر کے ایک گرجا گھر میں اتوار کے دن پابندی سے دو پادری مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو بپتسمہ کی رسم ادا کرا کے

عیسائیت میں داخل کر رہے ہیں، اور ایک چھوٹی حوض نما جگہ میں انہیں ڈبکی لگوائی جاتی ہے اور یسوع مسیح سے وفاداری کا حلف دلایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے ہرگز یہ باور کرانا مقصود نہیں کہ مسلمانوں میں دعوت وتبلیغ کا کام بالکل ہی مفقود ہے بلکہ صرف یہ احساس پیدا کرانا ہے کہ ہماری دعوت وتبلیغ اور سعی وکوشش ان کے مقابلے میں بہت ہی محدود اور معمولی ہے۔ مختلف ملکوں میں اللہ کے کچھ بندوں اور تنظیموں کی طرف سے بلاشبہ غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا کام ہو رہا ہے، اور اس کے مثبت اور مفید ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں لیکن ہماری یہ کوشش مربوط اور منظم اور منصوبہ بند نہیں ہے۔

ہم مسلمانوں کی ایک بڑی خامی اور کمی یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کے میدان میں جو افراد ہوتے ہیں اور جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں وہ اسلام قبول کرنے والوں کے بڑے بڑے اعداد وشمار شائع کرتے ہیں جبکہ بعض افراد اور تنظیموں کا کام بڑی حد تک کاغذی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اور تنظیمیں میڈیا میں آئے دن اپنا کارنامہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور بڑھ چڑھا کر تعداد دکھاتے ہیں جبکہ یہ صورت حال جہاں افسوسناک اور غیر دانشمندانہ ہے وہیں قبول اسلام کے واقعات کا چرچا بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور انہیں ہائی لائٹ کرنا بے وقوفی اور بہت بڑی بھول ہے، اسلام کے داعیوں اور مبلغوں کو اس حقیقت سے واقف ہونا چاہیے کہ اس سے اعداء اسلام چوکنا ہو جاتے ہیں اور اپنی کوششوں اور سرگرمیوں کو اور زیادہ تیز کر دیتے ہیں۔

ماضی قریب کی بات ہے کہ جنوبی ہند کے ایک گاؤں میناکشی پورم کے چند گھروں کے قبول اسلام کے واقعہ کو پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا نے بہت نمایاں کیا اور اس کے بعد ہندؤں میں مذہبی احیاپرستی جاگ اٹھی۔ متعدد ہندو تنظیمیں ملکی پیمانے پر سرگرم ہوگئیں، اس سلسلے میں ہم مسلمانوں کو عیسائیوں کی مشنریز سے سبق لینا چاہیے کہ کس طرح وہ مخفی انداز سے اپنی دعوتی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں اور عیسائیت قبول کرنے والوں کو لائٹ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی مشنریز اپنے ہدف اور مشن میں کامیاب ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ عیسائی مشنریز پر روک لگے، اور عیسائیت کی تبلیغ پر روک لگے تو ہم کو غیر مسلموں میں دعوت کے کام کو زیادہ بڑے پیمانے پر اور زیادہ منصوبہ بند اور منظم انداز میں انجام دینا ہوگا۔

اور اپنے مالی اور افرادی وسائل کا خاطر خواہ حصہ اس کام میں لگانا ہوگا۔ مبلغوں اور داعیوں کی زبردست ٹیم تیار کرنی پڑے گی، اور پوری دنیا میں اسلامی مبلغوں کو روانہ کرنا پڑے گا، اس کے لئے تمام دعوتی اصلاحی تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہونا ہوگا۔ اور مل بیٹھ کر اور سر جوڑ کر نئے حالات کے لئے لائحہ عمل طے کرنا ہوگا، اگر ہم مسلمانوں نے ایسا کر لیا تو بعید نہیں کہ حالات میں کافی حد تک تبدیلیاں ہوسکتی ہیں اور دنیا کا منظر نامہ بدل سکتا ہے۔

☆☆☆

پیغام کربلا

آج حسینی کردار کی پھر ضرورت ہے

مولانا محمد مجیب الدین قاسمی (ایم اے)
mujeebuddin2012@gmail.com

انسانی تاریخ کے ہر دور میں حق و باطل کے معرکے ہوتے رہے، ازل سے ان دو قوتوں کے مابین نبرد آزمائی جاری ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ چلتا رہے گا، باطل ہر دور میں اپنے لاؤ لشکر اور عسکری قوت پر ناز کرتے ہوئے حق کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتا رہا؛ لیکن تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ حق کے علمبردار ظاہری بے سروسامانی کے باوجود باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے، نصب العین کی صداقت اور مقصد کی پاکیزگی نے ہمیشہ حق کا بول بالا کیا؛ چنانچہ ۱۰/ محرم الحرام ۶۱ھ کو کربلا کے ریگزار میں پیش آمدہ واقعۂ کربلا بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، اس معرکہ میں جن نفوسِ قدسیہ نے حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اسلام کی مہتم بالشان عمارت کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے اسلام کی تعلیمات کو منسوخ ہونے سے بچایا وہ انسانی تاریخ کا اہم واقعہ ہے جسے ہر دم یاد رکھنا انسانیت کی رہنمائی اور رہبری کے لئے ناگزیر ہے۔

واقعۂ کربلا اپنے اندر وہ لافانی پیغام رکھتا ہے کہ ہر دور میں اسی سے قافلۂ انسانی کو ایک نیا عزم وحوصلہ ملتا ہے؛ مگر مسلم سماج کے افکار وخیالات اور عوامی سوچ کا مطالعہ رکھنے والے باخبر علماء اور اصلاح وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے حضرات اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتے کہ امت کا ایک بڑا طبقہ شہادتِ حسینؓ کے حقائق سے آج بھی ناواقف ہے اور واقعۂ کربلا سے متعلق جن ضروری باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے ان سے بھی غافل ہے، ذیل میں واقعۂ کربلا سے متعلق چند حقائق اور ضروری معلومات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سب سے پہلی حقیقت جو اس بحث میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ حضرت سیدنا حسینؓ نے شہادت کیوں دی اور اس واقعہ کے پیش آنے کا سبب کیا تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے یزید کی خلافت کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا، آپؓ کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے غلط اور غیر دینی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس لئے یزید کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا، خلافت ایک اہم ذمہ داری ہے، اس لئے خلیفہ کے انتخاب میں دینی طریقہ اور متفقہ اصول کو ہی اپنایا جاسکتا ہے؛ کیونکہ امت غیر دین پر متفق نہیں ہوسکتی، موجودہ طریقہ انتخاب (حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا اپنی حیات میں یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا اور اس سلسلہ میں بیعت لینا) کی صورت میں دین کی حقیقی صورت پامال ہوجاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ پر داغ اور خلفائے راشدین کی سنت سے انحراف لازم آتا ہے اس لئے اسے کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا

جاسکتا؛ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں انتخاب خلیفہ کی تین نظیریں ہیں (۱) یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی طرح کسی کو نامزد نہ کیا جائے؛ بلکہ مسلمان جسے چاہیں اپنی پسند سے منتخب کرلیں (۲) یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیا جائے جس کا موجود خلیفہ سے کوئی خاندانی تعلق نہ ہو (۳) یا پھر حضرت عمرؓ کی طرح چند آدمیوں (اصحاب الرائے) میں سے کسی ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے؛ اس کے علاوہ چوتھا طریقہ قابل قبول نہ تھا اور نہ ہی اس کی کوئی نظیر؛ اسی لئے حضرت سیدنا حسینؓ نے امت محمدیہ کو سنت محمدی پر قائم اور کاربند رکھنے کے لئے اور اسے انتخاب خلیفہ کے مسئلہ میں ایک نیا اور غیر ثابت طریقہ اختیار کرنے سے بچانے کے لئے اپنی اور اپنے خانوادہ کے ۷۲/ جانثاروں کی شہادت کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ کسی صورت میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہماری حیات ہی میں اس اہم مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ کر قیصر وکسریٰ کے طریقہ کو اختیار کرلیا جائے؛ بلکہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ نبیؐ اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کریں اور ان کے اسوہ کے مطابق ہی انتخاب خلیفہ ہو۔

حضراتِ صحابہ بھی یہی رائے رکھتے تھے؛ مگر اس وقت کے سیاسی حالات کے دباؤ میں آکر مسلم عوام اس کا کھل کر مطالبہ نہ کرسکے لیکن بعض جلیل القدر صحابہ (جنہوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنا نمائندہ بنایا تھا) نے یہ بات حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے رکھی کہ انتخاب خلیفہ سابق کی طرح تین نظیروں ہی میں سے ہو جب کہ امیر معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کے سلسلہ میں مکہ آئے ہوئے تھے؛ لیکن جب بعد میں یزید (۶۰ھ تا ۶۴ھ) نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور عام مسلمان رعایا سے اس کی بیعت لی جانے لگی تو بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی، اس وقت بھی یہ حضرات اپنے موقف پر قائم رہے، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے تو آخر وقت تک یزید کی خلافت پر بیعت نہ کی؛ البتہ دیگر حضرات صحابہؓ مصالح وقت کی رعایت میں خاموش رہے اور از سر نو انتخاب کے مطالبہ کو موزوں نہ سمجھا؛ لیکن حضرت حسینؓ کی نبض شناس نگاہیں محسوس کررہی تھیں کہ یزید کے عزائم کچھ الگ ہیں، نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین نے اپنی قربانیوں کے ذریعہ جس دین کو قائم کیا تھا ۶۰ھ میں اس کی بنیادوں کو ہلا دینے کا کام یزید اور اس کے حواری کررہے تھے، اسلامی دستور اور اسلامی مزاج کو یکسر بدل کر رکھ دیا جارہا تھا، مسلمانوں کا بیت المال حکمرانوں کے لئے سامانِ عیش بنا ہوا تھا، خدا اور خلقِ خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور دھندلا پڑتا جارہا تھا؛ ایسے ماحول میں حضرت حسینؓ کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ گوشہ نشین ہوجاتے یا مصلحت کا راستہ اختیار کرتے؟۔

حضرت سیدنا حسینؓ کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ باطل کو بے نقاب کرنا ہی حق کے علمبردار ہونے کا ثبوت ہے؛ چنانچہ آپ نے نہ باطل سے سمجھوتا کیا نہ ہی اسلامی اصول اور اقدار کیخلاف انتخاب خلیفہ کے عمل کو برداشت کیا بلکہ ہر طرح سے باطل کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی؛ مگر جب باطل ہی حق کو شکست وریخت سے دوچار کرنے کے درپے ہوگیا تو حضرت حسینؓ نے بھی اپنے جذبہ ایمانی کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا کو یہ بتادیا کہ نظریہ اور مقصد اہم ہوتا ہے، حق وصداقت کے معاملے میں اکثریت واقلیت کوئی معنی نہیں رکھتی، ساری دنیا بھی مل کر باطل کی پشت پناہی کرے تو باطل حق نہیں بن جاتا اور نہ ہی اس کو اپنایا جاسکتا ہے، اس کے خلاف حق کے داعیوں کو بہرحال میدان میں آنا ہی پڑتا ہے؛ خواہ وہ میدان کارزار ہو یا پھر کوئی دوسرا میدان، یاد رکھیں! حضرت سیدنا حسینؓ نے کربلا کا یہ معرکہ اقتدار کے حصول کے لئے نہیں کیا؛ بلکہ

اسلام کی آفاقی تعلیمات اور انسانیت کے اعلیٰ اقتدار کے تحفظ کے لئے یہ پرخطر راستہ طے کیا؛ کیونکہ آپؓ بخوبی جانتے تھے کہ اگر خلافت کی جگہ ملوکیت کو پنپنے دیا گیا تو دنیا میں پھر ظلم وجبر کو روکنا ناممکن ہوجائے گا، خلافت کا وہ نظام جس کے ذریعہ عدل وقسط کو دنیا میں قائم کیا گیا تھا اس کا بقا مشکل ہوجائے گا، اسی لئے آپ نے اس نظام ملوکیت کے خلاف آواز اٹھائی اور آخری دم تک باطل سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، حضرت سیدنا حسینؓ نے اپنی شہادتِ عظمٰی کے ذریعہ دراصل اس خلافت کے نظام کو بچانے کی آخری حد تک سعی فرمائی جو اسلام کا عین مزاج تھا؛ اگر آپؓ بالفرض یزید کی حکمرانی پر اپنی مہر تصدیق لگادیتے تو آج دنیا میں لوگوں کو کہنے کا موقع مل جاتا کہ اسلام میں بھی خاندانی یا موروثی نظام کی اجازت ہے، ان سارے شکوک وشبہات کے اٹھنے سے پہلے حضرت حسینؓ نے اپنی شہادت کے ذریعہ ساری انسانیت اور بالخصوص اہل ایمان کو یہ پیغام دے دیا کہ اسلام کے پیغام میں رتی برابر بھی تبدیلی کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی؛ اگر کوئی طاقت اسے اپنے اقتدار کے ذریعہ تبدیل کرنا چاہے تو اہلِ حق پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس تبدیلی کے خلاف صف آراء ہوجائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل وکردار کی طاقت اگر رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کے لئے ہوتو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرایا جاسکتا ہے؛ ہرسال ۱۰/محرم الحرام کے موقع پر واقعۂ کربلا کو مختلف انداز میں دہرایا جاتا ہے؛ لیکن شہادت حسینؓ کا جو اصل پیغام ہے یا سنتِ نبوی کے احیاء کا بنیادی مطالبہ یعنی صحیح دینی طریقۂ انتخاب کی خاطر ان کی اور ان کے جاںنثار رفقاء کی شہادت کی بات دب کر رہ جاتی ہے، اس نقطۂ نظر پر سرے سے کوئی غور نہیں کیا جاتا؛ حالانکہ سانحۂ کربلا کے پسِ منظر میں یہی روح کارفرما ہے۔

واقعۂ کربلا محض کوئی حادثۂ اتفاقی یا صرف ماضی کا ایک ورثہ نہیں ہے؛ بلکہ شہادتِ عظمٰی کا ایک ابدی پیغام ہے، اس کے ہر پہلو سے دنیا کو ایک نیا سبق ملتا ہے، دراصل شہادت حسین کا عنوان اتنا وسیع ہے کہ ہر قوم اور ہر خطے کے لوگ اس سے درس بصیرت حاصل کرسکتے ہیں؛ چنانچہ موجودہ حالات کے تناظر میں واقعۂ کربلا کی معنویت اور عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے؛ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہادت حسینؓ کی عصری معنویت کیا ہے؟ آج انسانیت کے لئے اس سانحہ میں کیا درس پوشیدہ ہے؟ اکیسویں صدی کے اس برق رفتار عالمی منظر نامے میں شہادت حسین سے دنیا کے مظلوم کیا سبق حاصل کرسکتے ہیں؟ عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت حسینؓ کے چاہنے والے دنیا میں عزت ووقار کی زندگی کیسے گزار سکتے ہیں؟ اور خون کے آنسو رلانے والا یہ سانحہ فدائیان حسینؓ میں کشمکش حیات کا کونسا نیا انقلاب پیدا کرتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے عالمی منظر نامہ میں مسلم ممالک کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب ستاون کروڑ ہے اور ۵۷/ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اقتدار کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھ میں ہے؛ لیکن افسوس کہ اس وقت دنیا کے کسی بھی خطہ میں خلافت کا وجود نہیں، جب کہ خلیفہ یا امیر کے بغیر جینا جاہلیت کی زندگی ہے(مسلم:۲/ ۱۲۸، **کتاب الامارۃ، باب وجوب لزوم جماعۃ المسلمین**) یہاں تک کہ سفر میں بھی دو تین لوگ ہوں تو کسی ایک کو امیر بنالینے کی تلقین کی گئی ہے، ان تعلیمات پر ایمان رکھنے والے مسلمان آج تقریباً ایک صدی سے بغیر خلیفہ کے زندگی گزار رہے ہیں، کیا وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوسکتے ہیں کہ ان کی زندگی مکمل اسلامی زندگی ہے؟۔

حضرت سیدنا حسینؓ کی ان کوششوں اور قربانیوں کا واحد مقصد نظام خلافت کا احیاء تھا اور یہ کہ مسلمان صحیح اسلامی طریقہ پر

اپنے خلیفہ کا انتخاب کریں اور اس کی صالح قیادت میں زندگی گزاریں، اس لئے شہادت حسینؓ کے حوالہ سے اس بات کی یاددہانی کرائی جانی چاہئے کہ دور حاضر میں مسلمانوں کی بہت بڑی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ خلافت کے احیاء اور قیام کے لئے کوششیں کریں، طلبہ اور بچوں کی اسی نہج پر تربیت کریں، مسلم عوام میں اس تعلق سے شعور و بیداری پیدا کریں، ان کو اس ذمہ داری کا احساس دلائیں اور اس ضمن میں ان کی پوری طرح علمی و عملی رہنمائی کریں تا کہ قیام خلافت کی راہ ہموار ہو سکے اور وہ خلافت کا بھاری بار سنبھالنے کے متحمل ہو سکیں۔

واقعۂ کربلا میں اس پہلو پر خاص کر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک طرف حضرت سیدنا حسینؓ کا یہ اعلیٰ کردار ہے کہ قصر خلافت کی ایک اینٹ نکال دی گئی تو وہ صبر نہ کر سکے اور اس اینٹ کو لگانے اور قصر خلافت کو اپنی اصلی حالت پر لوٹانے کے لئے اپنی جان تک دے دی، دوسری طرف آج کے مسلمان ہیں کہ زمانہ ہوا قصر خلافت ڈھا دیا گیا، اس کے اینٹ اور پتھر تک چرائے گئے، لیکن انہیں اس کا کوئی غم نہیں بلکہ وہ خوش وخرم اپنی دنیا میں مگن ہیں، آج جب کہ فلسطین سے لے کر افغانستان تک اور عراق، شام، لبنان، سیریا اور مصر سے لے کر دنیا کے چپے چپے میں اسی طرز حکومت کی خاطر خون کی سرخی سے حضرت سیدنا حسینؓ کے نانا کے دین کو ماننے والوں کی تاریخ لکھی جا رہی ہے، یزید وقت ان مسلم ممالک میں دین کے بنیادی اصولوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایسے نازک وقت اور سنگین حالات میں ۱۰/محرم الحرام ۶۱ھ کا یہ واقعہ کربلا امت مسلمہ کو اپنے اسلاف کی تاریخ دہرانے کا جذبہ عطا کرتا ہے اور انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر باطل کے خلاف نبرد آزمائی کا حوصلہ دیتا ہے، گرچہ واقعۂ کربلا کو ہوئے صدیاں بیت گئیں؛ لیکن تاریخ کے ہر دور میں حضرت حسین کی شہادت کا یہ واقعہ آپ کے چاہنے والوں کو یہی درس دیتا ہے کہ دنیا کی چیرہ دست طاقتیں، اسلام دشمن اور باطل قوتیں حق کے پیغام کو یقیناً ٹھنڈے پیٹ قبول نہیں کریں گی، جب جب حق کا غلغلہ ہوگا، باطل لرزہ براندام ہو جائے گا؛ لیکن حق کے متوالوں کو اپنی جان اور مال کی پرواہ کئے بغیر میدان کارزار میں آنا ہوگا اور حق کے تحفظ کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار رہنا ہوگا، امتِ مسلمہ میں اسی انقلابی کردار کے نہ ہونے کے نتیجے میں یہ امت ہر جگہ باطل کے شکنجہ میں کسی ہوئی ہے، ۵۷/اسلامی ممالک کے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے سے غاصبانہ ملک کی دہشت گردی کو عالم اسلام روکنے سے مجبور ہے، زائد از ۶۰/سال اسرائیل کی بربریت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے؛ لیکن کوئی اسے لگام دینے والا نہیں ہے، دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہونے کے باوجود دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں مسلمانوں کو امان حاصل ہے، مصر، عراق، شام، لیبیا، سیریا اور دیگر بلاد اسلامیہ میں مسلمانوں کا جو کشت وخون بہا اور ان کے لہو سے جو خون آشام ہولی کھیلی گئی ہے ان مظلوموں کا خون چیخ چیخ کر سوال کر رہا ہے کہ دنیا کے بے شمار وسائل حیات پر اپنا قبضہ رکھتے ہوئے بھی یہ امت دوسروں پر منحصر کیوں ہے؟ اقوام متحدہ کیوں غیروں کے ہاتھ کی کٹ پتلی بنی ہوئی ہے؟ مرسی اور اخوان المسلمین کے ساتھ ایسی بربریت ووحشت ناکی کیوں روا رکھی گئی، شامی، لبنانی مسلمانوں کے ساتھ ایسی سفاکی و درندگی پر دیگر اسلامی ممالک (جو صرف نام کے اسلامی ممالک ہیں) خاموش تماشائی کیوں بنے رہے، موجودہ عالمی منظر نامے میں مسلمانوں اور اسلامی ممالک کی جو صورت حال ہے اس تناظر میں آج اسی حسینی کردار کی پھر ایک بار ضرورت ہے کیونکہ دنیا سے ابھی یزیدی دور کا خاتمہ نہیں ہوا، نہ صرف بلاد اسلامیہ بلکہ ہمارے ملک اور پڑوسی ملک میں بھی آئے دن ایسے

واقعات وحادثات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کے سد باب کے لئے حسینی کردار کی ضرورت ہے، آج بھی اگر حضرت حسینؓ کے چاہنے والے اور ان سے اپنی وابستگی پر فخر جتلانے والے آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند بن جائیں تو باطل کی ساری ریشہ دوانیوں کا سد باب ہوسکتا ہے؛ لیکن افسوس کہ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے اور آزمائشوں کے لامتناہی سلسلے کے باوجود شہدائے کربلا سے اپنا رشتہ جوڑنے والے خود آپس میں ایک دوسرے سے بغض وعناد رکھتے ہیں، انتشار وافتراق ان کی پہچان بن گیا ہے؛ ایسے میں وہ حسینی کردار ہم میں کیسے پیدا ہوسکتا ہے جس کے ذریعہ ہم دنیا میں حق کے علمبردار بن کر اٹھ سکیں۔

عصر حاضر میں شخصیات پر سمینار کرنے یا ان کی خدمات کا تذکرہ کرنے کے لئے خصوصی مجالس کا انعقاد کرنے کی روایت چل پڑی ہے اس کے ذریعہ عوام وخواص کو اپنی پسندیدہ شخصیت سے متعارف کرایا جاتا ہے، ان کی حیات وخدمات سے متعلق مقالات پیش کئے جاتے ہیں اور انہیں کتابی صورت میں شائع بھی کیا جاتا ہے۔ حضرت سیدنا حسینؓ کی یاد میں اگر اس طرح کے کسی جلسہ یا مجلس کا اہتمام کیا جائے تو چاہئے کہ اس میں ان کی سیرت وشہادت کا ذکر ہو، ان کے اخلاق ومحاسن کا مؤثر بیان ہو، صحیح اور مستند حوالوں کی روشنی میں واقعہ کربلا پر جامع اور پر مغز خطابات ہوں، شہادت کی فضیلت سے متعلق مفصل گفتگو ہو، حاضرین وسامعین کے دلوں میں شہادت کی آرزو پیدا کی جائے، خلافت اسلامی کی ضرورت اور تقاضوں پر علمی محاضرات پیش کئے جائیں اور امت مسلمہ کو احیائے خلافت اسلامیہ کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کے لئے تیار کیا جائے، حضرات صحابہ وتابعین کے مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالی جائے، ان پر طعن وتشنیع کی قباحتوں کو واضح کیا جائے، نیز اسلاف واکابر کے لئے دعائے مغفرت کی جائے۔ اس موقع پر عوام کے سامنے یہ حقیقت بھی بیان کی جائے کہ تاریخ میں صرف حضرت حسینؓ کی شہادت ہی نہیں ہے بلکہ شہادت کی ایک طویل تاریخ ہے جو آج بھی جاری ہے اور امت مسلمہ کے لئے اسوہ ہے، شہداء کی یہ سنہری کڑی ہابیل وقابیل کے واقعہ ہی سے شروع ہوتی ہے، گزشتہ انبیاء اور ان کے متبعین سے ہوتے ہوئے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام نے ایک بار پھر شہادت کی تاریخ کو دہرایا ہے، غزوۂ بدر واحد، غزوۂ احزاب وتبوک اور غزوۂ حنین وطائف میں بہت سے بلند مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں شہید ہوئے، جہاد وشہادت کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور جب تک اس دنیا میں سچے اور باوفا اہل ایمان زندہ ہیں یہ سلسلہ جاری رہے گا انشاء اللہ۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حضرت سیدنا حسینؓ کی سیرت مبارکہ کم ہمت اور کوتاہ عمل مسلمانوں کے لئے ایک چیلنج ہے جو دعوت عمل دیتی ہے کہ جب جب دنیا میں حق وباطل کے درمیان پنجہ آزمائی کا مرحلہ آئے گا حضرت حسینؓ کی شہادت حق کے علمبرداروں کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوگی، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان حضرت سیدنا حسین کے فداکار اور چاہنے والے ان حقائق کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیں، امت مسلمہ میں (جہاں اسلامی احکام وقوانین کی تنفیذ کا عمل جاری ہے اور اسلامی حکومتیں قائم ہیں) احیائے خلافت، خدمت دین وملت اور شوق جہاد کا ویسا ہی جذبہ پیدا کیا جائے جیسا کہ حضرت سیدنا حسینؓ اور ان کے جانثار اصحاب میں تھا، اسلام کا تعارف بحیثیت مکمل نظام زندگی کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کیلئے ہر ممکن کوشش کی جائے، یہی حضرت سیدنا حسینؓ کی شہادت کا حقیقی پیغام ہے اور آج امت مسلمہ کو اس کی ضرورت بھی ہے کیونکہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

☆☆☆

پیغام کربلا

محرم الحرام کا پیغام- ہم مسلمانوں کے نام

محمد حماد کریمی ندوی
hammadkarimi93@gmail.com

اللہ تعالی نے جو بھی مخلوق پیدا کی ہے، ان میں سے بعض کو افضل اور بعض کو مفضول بنایا ہے، اسی بنا پر جنت الفردوس کا مقام تمام جنتوں سے اعلی وارفع ہے، جس طرح حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار وسرتاج ہیں، جس طرح امت محمدیہ تمام امتوں پر فوقیت رکھتی ہے، جس طرح دین اسلام تمام ادیان وملل میں عظیم تر اور بڑھکر ہے، جس طرح لیلۃ القدر تمام راتوں میں بابرکت و با عظمت ہے، جس طرح جمعہ کا دن سید الایام ہے، ٹھیک اسی طرح سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینوں کو اُشہر حرم قرار دیا گیا ہے۔

قرآن میں ہے ﴿إِنَّ عِـدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْراً فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَـعَةٌ حُـرُمٌ﴾ پھران چار مہینوں میں محرم کا مہینہ بہت سی خصوصیتوں اور فضیلتوں کی بنا پر اعلی مقام رکھتا ہے۔

چونکہ اس مہینہ کی عظمت ہر زمانے اور ہر دور میں رہی ہے اس بنا پر اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،

(۱) ماقبل اسلام اس کی تعظیم: اس کی دو قسمیں ہیں: ا۔ تشکرانہ تعظیم، ۲۔ جاہلانہ تعظیم۔

(۲) اسلام کی عادلانہ تعظیم۔

(۳) مابعد ظہور اسلام بعض فرقوں کی غالیانہ تعظیم۔

اب آیئے پہلے ماقبل اسلام پر ایک نظر ڈالتے ہیں، اسلام سے قبل اس مہینہ کی تعظیم اہل کتاب بھی کرتے تھے اور کفار مکہ بھی، اہلِ کتاب چاہے وہ کسی بھی نبی کے ماننے والے ہوں اسکی تعظیم کرتے تھے، جس کی وجہ خود احادیث میں موجود ہے کہ ہر نبی کو اس مہینہ میں کوئی نہ کوئی عظمت وفضیلت کی چیز حاصل ہوئی، مثلاً حضرت موسیٰ کو فرعون سے نجات ملی، حضرت عیسیٰ اسی دن پیدا ہوئے اور اسی دن ان کو آسمان پر اٹھایا گیا،، وغیرہ وغیرہ۔

آپ حیرت میں رہ جائیں گے کہ وہ کفار مکہ جن میں ہر قسم کی برائی عام تھی، جنہیں دوسری قوم کے لوگ غیر مہذب وغیر مثقف سمجھتے تھے، اس مہینہ میں جنگ سے باز رہتے، اسی بنا پر اگر جنگ ناگزیر ہوتی تو مہینہ کی تقدیم وتأخیر کر لیتے لیکن اس مہینہ کی حرمت کی پامالی گوارہ نہ کرتے، اور جو اس کی حرمت کو پامال کرتا اس کو نہایت ہی کمتر وذلیل سمجھتے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کے مطابق جس کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے اس مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ بھی رکھتے۔ یہ تو رہا اسلام سے ماقبل کا حال۔

قرآن خاص طور پر حدیث میں اس کی بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں ،ان کے ذکر سے پہلے چند ضروری چیزوں کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۱)لفظ محرّم باب تفعیل کے مصدر تحریم سے اسم مفعول کا صیغہ ہے،تحریم کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں ،چونکہ یہ مہینہ قابل عظمت ہے اس لئے اس کا نام محرم ہے۔

(۲)اس مہینہ میں ایک دن ہے جس کو یومِ عاشوراء کہتے ہیں، یہ لفظ مشتق ہے عشر سے جو ایک معین عدد کا نام ہے، البتہ امام قرطبیؒ نے اسکو عاشرہ سے معدول مانا ہے۔

(۳)عاشورہ کی وجہ تسمیہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے دو ذکر کی ہے:

۱۔یہ محرم کی دسویں تاریخ ہوتی ہے۔۲۔اس دن دس انبیاء کو دس خصوصیات سے نوازا گیا، اس لئے اس کو یوم عاشورہ کہتے ہیں۔

اسلام نے "شرع ماقبلنا شرع لنا ما لم یخالف شرعنا" کے اصول کے تحت نہ صرف اس کی عظمت کو باقی رکھا، بلکہ اسکی عظمت میں اضافہ اور اس کو دوبالا کیا،لہٰذا وہ کام جو اس مہینہ میں مسنون قرار دئے گئے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)محرم کے پہلے عشرے کے روزے: ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کی طرح محرم کے پہلے عشرہ تک روزے رکھنا سنت مؤکدہ ہے۔شیخ ابن حجر ہیثمیؒ فرماتے ہیں:" فان صوم العشر الأول من المحرم سنة مؤكدةٌ بل صوم الشهر كله سنة كما دلت عليه الأحاديث" نبی کریم ﷺ نے فرمایا:"أفضل الصيام بعد رمضان شهر الله الحرام "رواه مسلم۔ دوسری ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ مجھے ایسا مہینہ بتلا دیجئے کہ جسمیں میں رمضان کے بعد روزے رکھوں، آپؐ نے فرمایا کہ محرم کے روزے رکھو اس لئے کہ یہ اللہ کا وہ مہینہ ہے جس میں ایک دن ایسا ہے کہ اس دن اللہ تعالی نے ایک قوم کی دعا قبول فرمائی اور دوسرے لوگوں کی بھی دعا قبول فرمائے گا،ابن حجر ہیثمیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "أن السلف كانوا يعظمون ثلاث عشرات، عشر رمضان الأخير، و عشر ذى الحجة، و عشر محرم الأول".

(۲)یوم عاشورہ کے کام: بعض لوگوں نے اس دن بارہ کاموں کو اجر و ثواب کا باعث بتایا ہے۔لیکن ان میں صرف تین کام مسنون ہیں.

۱۔عاشورہ کا روزہ: جمہور کے نزدیک یہ روزہ سنت ہے،حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ (حضورؐ عاشورہ کا روزہ رکھتے اور اس کو رکھنے کا حکم دیتے) نیز حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عاشورہ کے روزہ کے ثواب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا (يكفر السنة الماضية) حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں صرف دس تاریخ کا ہی روزہ رکھا تھا البتہ آخری عمر میں آپؐ نے یہودیوں کی مخالفت کے لئے فرمایا (لئن بقيت الى قابل لأصومن التاسع) رواه مسلم.

۲۔دوسرا کام عاشورہ کے دن صدقہ کرنا ہے. یوں تو نفل صدقہ ہر وقت سنت ہے،لیکن اچھی جگہوں اور اچھے موقعوں پر صدقہ سے استحباب میں اضافہ ہوتا ہے،اور علماء نے اس کی صراحت بھی کی ہے۔

۳۔اہل وعیال پر وسعت کے ساتھ خرچ کرنا: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے حضور ﷺ نے فرمایا (من وسع على عياله يوم عاشوراء لم يزل فى سعته سائر سنته) اس حدیث کو بہت سے علماء اور اساطین امت نے صحیح قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی احادیث میں اس کی اہمیت وفضیلت وارد ہوئی ہے جن میں سے ہر ایک کا احصاء دشوار ہے۔

(۳) رہا مسئلہ ظہور اسلام کے بعد تعظیم کا: تو اس مہینہ میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بنا پر جمہور اہل سنت والجماعت نے بھی اس کو باعث تعظیم مانا ہے. مثلاً حضرت عمرؓ کا اس مہینہ سے اسلامی تقویم کا آغاز کرنا، حضرت عمرؓ کی شہادت کا حادثہ، اسی طرح حضرت حسینؓ کی شہادت کا وہ المناک و کربناک حادثہ کہ جس کو دیکھ کر شیطان بھی اس دن شرما گیا ہوگا. یہ تمام چیزیں یقیناً اس دن کی اہمیت وعظمت میں اضافہ کرتی ہیں، اور ہمیں بہت سے نصیحت آمیز درس دیتی ہیں، لیکن صرف حضرت حسینؓ کی شہادت کی بنا پر اس کی عظمت کو ماننا اور دوسروں کی قربانیوں کو نظر انداز کرنا، اسی طرح بدعات و خرافات اور واہیات کے ایک عظیم سمندر کو رواج دینا، یہ کہاں کی عقلمندی اور انصاف کی بات ہے،؟؟؟ حد تو یہ کہ ان لوگوں نے اس کو رواج دینے کیلئے ہر طرح کے حربے استعمال کئے، غلط روایات گڑھ کر لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ امت کا ایک بڑا طبقہ ان کے بہکاوے میں آکر راہ حق سے ہٹ گیا۔

چونکہ بدعات وخرافات کا ایک سیلاب ہے، اس بناء پر بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ واعظوں کو چاہئے کہ وہ اپنے وعظ میں صرف امام حسینؓ کی شہادت کو موضوع سخن نہ بنائیں تاکہ روافض کی مشابہت نہ ہو بلکہ پہلے دوسرے واقعات کو بیان کیا جائے۔

ماہ محرم کا پیغام ہم مسلمانوں کے نام

اسلامی جنتری کا نیا سال محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے، سالِ نو کے آغاز پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی ہے، اور عام طور سے ذھن میں ایک دھندلا سا یہ خیال آتا ہے کہ اب سے چودہ سو سال قبل ہجرت نبوی کا واقعہ پیش آیا تھا، اور اس پر اتنے سال گذر گئے ہیں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

حالانکہ ہجرت نبوی اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، جس میں امت مسلمہ کیلئے ایثار وقربانی، جانفشانی و جانفروشی، ایمان و یقین، معرفت ومحبت کے ہزار ہا پیغام ہیں اور جس میں اللہ تعالی کی ہزاروں حکمتیں اور رحمتیں پنہاں تھیں اور ہیں۔

بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ''یہ تاریخ عالم صرف نقل مکانی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ نقل زمانی، بلکہ نقل انسانیت کی پیدائش نو کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے ذریعہ سے نہ صرف ذات نبوی اور آپ کے دست گرفتہ اور دامن گیر وفاداروں کی ایک جماعت دشمنوں کے غیظ وغضب اور مکر وکید سے محفوظ ہوئی، بلکہ پوری نوع انسانی اور عالم انسانیت کیلئے نصرت ورحمت، حفاظت وقوت اور نجات (بلکہ انسانیت کے اندر پیدائش نو کا) ایک دروازہ کھل گیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا تفصیلات کے نتائج میں جو چیزیں قابل توجہ ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جتنے فضائل وسنن اس سلسلہ میں مذکور ہیں ان کو عمل میں لانے کی کوشش کریں.

۲۔ بدعات وخرافات کو ختم کرنے کی کوشش کریں.

۳۔ ہجرت کا جو پیغام ہے اس سے ہم عبرت ونصیحت اختیار کریں.

اللہ سے دعا ہے کہ ہم کو اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ أنیب

☆☆☆

رہنما خطوط

رہنمائے طلبہ- کیسے چنیں اپنا مقصد؟

فیروز عالم ندوی
یونیٹی پبلک اسکول، چنئی

اگر آپ پانچ سو روپیہ کا ایک نوٹ لیکر ریلوے اسٹیشن کی ٹکٹ کھڑکی پر جائیں تو وہاں بیٹھا شخص آپ سے جو سوال کرے گا وہ یہ ہوگا کہ: آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ: مجھے نہیں معلوم میں تو صرف ٹرین میں سوار ہونا چاہتا ہوں، تو وہ شخص یقیناً آپ کو کسی متعل ہسپتال جانے کا مشورہ دے گا۔

مذکورہ بالا مثال سے مقصد کی اہمیت اور معقولیت واضح ہو جاتی ہے۔اس کے باوجود ہم میں سے بہت سارے لوگ اپنی زندگی یوں ہی بغیر کسی مقصد کے گذارتے ہیں۔ہمیں زندگی میں کہاں جانا اور کیا بننا ہے؟ اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے ،ہمیں تو صرف ٹرین میں سوار ہونے کی جلدی ہوتی ہے کیوں کہ ہر ایک اسمیں سوار ہو رہا ہے۔ بحیثیت مسلمان اللہ تعالی نے ہمیں ایک متبادل مقصد (حصول جنت) عطا کیا ہے جس کی خاطر ہر مسلمان حسب مقدور اور توفیق عمل کرتا ہے۔ٹھیک اسی طرح اگر زندگی میں کچھ اہم چیز حاصل کرنا ہو تو ہمیں ایک مقصد متعین کرنا ہوگا ۔ بامقصد زندگی کے کچھ فوائد یہ ہیں ۔

۱۔ عمل میں مرکوزیت آتی ہے۔

۲۔ اچھے اعمال کا صدور ہوتا ہے،لغویات سے حفاظت ہوتی ہے۔

۳۔ وقت اور محنت کی رائیگانی سے حفاظت ہوتی ہے۔

۴۔ ہمت میں بلندی آتی ہے۔

لوگ اکثر خواہش اور مقصد کے درمیان فرق نہیں کر پانے کی وجہ سے مغالطہ کے شکار ہو جاتے ہیں لہذا پہلے ان دونوں کے درمیان فرق سمجھ لینا بہتر ہوگا۔

خواہش : ایسی چیز جسے آپ زندگی میں چاہتے ہوں لیکن وہ خواب کے درجہ میں ہو،اس کے لئے کوئی عملی اقدام نہ ہو۔

مقصد : ایسی چیز جسے آپ زندگی میں چاہتے ہوں اور اس کے حصول کے لئے عملی اقدام کر رہے ہوں۔ یہ ''عملی اقدام'' خواہش اور مقصد کے درمیان حد فاصل ہے۔

مقصد کا تعین کیسے کریں؟

۱۔ مقصد مثبت ہو : جب آپ اپنا مقصد متعین کریں تو منفی جملہ یا سوچ کے استعمال سے گریز کریں، مثلاً

أ۔ میں ریاضیات کے امتحان میں فیل ہونا نہیں چاہتا ہوں۔

ب۔ میں ریاضیات کے امتحان میں پاس ہونا چاہتا ہوں۔

پہلی مثال منفی سوچ کی ہے جس میں '' فیل '' کو مرکوزیت

حاصل ہے۔دوسری مثال مثبت سوچ کی ہے،اس میں'' پاس کو'' کو مرکوزیت حاصل ہے ۔

۲۔ مقصد بلند وبالا ہو : ترمذی شریف کی ایک روایت ہے ، عبادۃ بن صامت رضي الله عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : جنت میں سو درجے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان کی مسافت آسمان وزمین کی مسافت کے برابر ہے اوراس میں سب سے اعلی درجہ ''فردوس'' ہے،وہیں سے جنت کی چاروں نہریں پھوٹتی ہیں،اسی کے اوپر عرش ہے۔ جب تم لوگ اللہ سے کچھ مانگوتو جنت الفردوس مانگو ۔

جنت مسلمانوں کا ایک مشترکہ مقصد ہے۔ نبی ﷺ نے اس حدیث میں سب سے اعلی جنت کے حصول کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ اپنے مقصد کو قلمبند کریں : مقصد کو حقیقی اور ٹھوس بنانے کے لئے اس کا لکھا جانا ضروری ہے،اس سے بھولنے کا خدشہ جاتا رہے گا۔اس کو لکھتے وقت پرعزم کلمات کا استعمال کریں،موہوم اور کمزور تعبیر کے استعمال سے گریز کریں کیونکہ یہ آپ کے مقصد پر اثر انداز ہوگا مثلاً: أ۔ ان شاءاللہ بہر حال/ بالضرور میں یہ کام کرونگا ۔

ب۔ ان شاءاللہ میں یہ کام کرسکتا ہوں ۔

ج۔ ان شاءاللہ ممکن ہے میں یہ کام کروں ۔

پہلی مثال بقیہ دو مثالوں کے مقابلہ میں زیادہ مؤکد ہے جو آپ کے پرعزم ارادہ کو ظاہر کررہی ہے ۔

۴۔ عمدہ (S.M.A.R.T)لائحہ عمل ترتیب دیں : مندرجہ ذیل چیزیں عمدہ لائحہ عمل کا لازمی جزو ہیں،اس کو ترتیب دیتے وقت ان چیزوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوگا ۔

S-(SPECIFIC) مخصوص ۔

M-(MEASURABLE) قابل تعین/تحدید ۔

A-(ACHIEVABLE) ممکن الحصول ۔

R-(RELEVANT) متعلق ۔

T-(TIME BOUND) وقت کی تعین/تحدید ۔

مخصوص (Specific) : آپ کا مقصد بہت ہی صاف اور نہایت ہی واضح ہونا چاہئے ۔ کسی بھی قسم کے ابہام یا عمومیت سے گریز کریں ۔ اپنے مقصد کو کثیر الجہت نہ ہونے دیں ۔ جب آپ مقصد متعین کررہے ہوں تو یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہئے کہ ترکیز کس عمل پر ہوگی۔

مخصوص اور واضح مقصد	مبہم اور عام مقصد
مجھے خوش خط اورالفاظ ومعانی (مفردات) کی صلاحیت کو بڑھانا ہے	مجھے اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا ہے
مجھے موبائل فون کی خوردہ تجارت شروع کرنی ہے	مجھے ایک تجارت شروع کرنی ہے

قابل تعین/تحدید (Measurable) : آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ نے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے؟ مقصد کو محدود کرنا ایک ایسا عمل ہے جو آپ کو اس سوال کا جواب دلا سکے گا۔

قابل تعین / تحدید مقصد	غیر قابل تعین/تحدید مقصد
مجھے سائنس کے پرچے میں ۸۰ فیصد نمبرات حاصل کرنا ہے	مجھے سائنس کے پرچے میں اچھے نمبرات حاصل کرنا ہے
مجھے فقہ میں گولڈ میڈل پی۔ایچ۔ڈی کرنا ہے	مجھے اعلی تعلیم حاصل کرنی ہے

مقصد کی تعیین اور تحدید کے بعد ہی آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا حصول ممکن ہے یا نہیں۔ بصورت دیگر ''اچھے نمبرات'' اور ''اعلیٰ تعلیم'' ایک مجہول چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

ممکن الحصول (Achievable) : اگر آپ ایک ایسا مقصد متعین کریں جس کے حصول کی امید خود آپ کو نہ ہو، ایسا مقصد آپ کے حوصلے پست کر دیگا اور آپ کی خود اعتمادی کو تباہ کر دیگا، مثلاً: میں ایک دن میں پانچ پارے یاد کرونگا۔ بہت آسان مقصد متعین کرنا بھی غیر مناسب ہے، مثلاً: میں ایک پارہ قرآن پانچ مہینوں میں یاد کرونگا، اس کو پورا کرنے میں بہت زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی جس کی وجہ سے آپ پژمردگی کے شکار ہو جائیں گے۔ اور مستقبل میں کوئی ایسا مقصد متعین کرنے سے ڈریں گے جس میں ناکامی کا اندیشہ ہو۔ ایک ایسا مقصد متعین کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ چیلنجنگ بھی ہو۔ ایسے کسی کام کے لئے ہمیں خود کو کم ہمتی اور آرام طلبی کے دائرہ سے باہر نکالنا ہوگا۔ اگر اس طرح کا کوئی کام کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اپنے آپ میں ایک طرح کا اطمینان اور مسرت کا احساس حاصل ہوگا۔

متعلق (Relevent) : مقصد ایسا ہو جو آپ کی ذاتی شخصیت، مطلوبہ میدان عمل اور کیریر (Career) سے میل کھاتا ہو۔ اگر ان میں صحیح تال میل ہو تو آپ اپنے مقصد کے لئے مطلوبہ چیزوں اور عمل پر اچھی طرح ترکیز (focus) کر پائیں گے۔ بصورت دیگر آپ خود اپنے متعین کئے ہوئے راستے سے بھٹک جائیں گے، اس طرح وقت و محنت کی رائیگانی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

وقت کی تحدید (Time bound) : مقصد میں ایک خاص وقت کی تحدید (Deadline) ہونی چاہئے۔ اس ڈیڈ لائن کو متعین کرتے وقت مطلوبہ وقت کی ضرورت اور کتنے کم وقتوں میں پورا کر سکتے ہیں کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا۔

محدود وقتی مقصد	غیر محدود
ان شاءاللہ میں ۲۰۱۷ء تک حدیث میں گولڈ میڈل پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرلونگا۔	ان شاء اللہ میں ایک دن اعلیٰ تعلیم مکمل کرلونگا۔

مذکورہ بالا محدود وقتی مقصد کی مثال ایک موزوں اور عمدہ مقصد کی تمام صفات پر مشتمل ہے۔

۵۔ لائحہ عمل کی تیاری (Action plan) : مندرجہ بالا امور کی انجام دہی کے بعد آپ کو فوراً ایک لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا، اس میں مقصد کے مطابق عملی اقدام کا ایک ایسا خاکہ بنانا ہوگا جو آپ کے مقصد کے حصولیابی کے لئے ضروری اور مطلوب ہے۔ اس کے ذریعہ دوران سفر آپ کو یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ آپ کا اگلا قدم کیا ہے؟ اور آپ اپنے مقصد کی جانب گامزن ہیں یا نہیں؟۔ اس مرحلہ کا سب سے آخری کام یہ ہے کہ اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیں۔ چلتے چلتے یہ بات یاد رکھیں کہ ''عمل'' مقصد اور خواہش کے درمیان حد فاصل ہے۔

واللہ الموفق والمستعان

☆☆☆

فکر فردا

صہیونیت، ہندوتو اور ہندوستان

احمد جاوید
ahmad.jawed@inquilab.com

یہ محض اتفاق ہے کہ گجرات کیڈر کے سینئر آئی پی ایس افسر سنجیو بھٹ کی برطرفی اور نومنتخب آئی پی ایس افسران کو ٹریننگ کے لئے اسرائیل بھیجے جانے کی خبر ایک ساتھ آئی۔ بھٹ کی شہرت ایک ایماندار پولیس افسر کی تھی لیکن اس کو حکومت نے ڈیوٹی سے بلا رخصت غیر حاضر رہنے کی بنا پر ۱۹/اگست کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ بھٹ نے ۱۹۸۸ء میں انڈین پولیس سروس کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ وہ دسمبر ۱۹۹۹ء سے ستمبر ۲۰۰۲ء تک گاندھی نگر میں اسٹیٹ انٹلی جنس بیورو میں ڈپٹی کمشنر آف انٹلی جنس تھے۔ ریاست کی داخلی سلامتی، سرحدوں اور اہم تنصیبات کے تحفظ کی نگرانی ان کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت کے طول وعرض میں پھیل جانے والے فسادات (فروری مارچ ۲۰۰۲) پیش آئے جس نے ہزاروں بے گناہوں کی جانیں لے لیں۔ ۹/ستمبر ۲۰۰۲ء کو وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے بہو چاراجی میں اپنے ایک خطاب کے دوران مسلمانوں کی شرح پیدائش پر ایک قابل اعتراض تبصرہ کیا تھا۔ قومی اقلیتی کمیشن نے حکومت گجرات سے رپورٹ مانگی۔ مودی حکومت کے پرنسپل سکریٹری پی کے مشرا نے یہ کہتے ہوئے رپورٹ دینے سے انکار کر دیا کہ حکومت کے پاس اس تقریر کا کوئی ریکارڈ یا نقل نہیں ہے اس لیے وہ رپورٹ دینے سے معذور ہیں لیکن اسٹیٹ انٹلی جنس بیورو نے کمیشن کو اس تقریر کی ایک کاپی مہیا کرادی۔ وزیر اعلیٰ نے سزا کے طور پر بیورو کے اعلیٰ افسران کا تبادلہ کر دیا جن میں سنجیو بھٹ، آر بی سری کمار اور ای رادھا کرشنن شامل تھے۔ بھٹ کو اسٹیٹ ریزو پولیس ٹریننگ کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

۲۰۰۲ء کے فسادات کے بعد سماجی کارکنان کے ایک گروپ نے گجرات فسادات کا تجزیہ کرنے کے لئے ایک سٹیزن ٹریبونل بنایا۔ گجرات کے وزیر داخلہ ہرین پانڈیا نے مبینہ طور پر اس ٹریبونل سے کہا تھا کہ ۲۷/فروری ۲۰۰۲ء کو گودھرا ٹرین سانحہ کے بعد ایک میٹنگ کی تھی اور پانڈیا کے مطابق وزیر اعلیٰ نے پولیس افسران سے کہا تھا کہ وہ ہندوؤں کے ردعمل کی راہ میں نہ آئیں۔ پانڈیا نے اس میٹنگ میں شریک کئی افسران کا بھی نام لیا تھا لیکن ان میں سنجیو بھٹ کا نام نہیں تھا۔ بعد میں پانڈیا کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے ۹/سال بعد ۱۴/اپریل ۲۰۱۱ء کو بھٹ نے سپریم کورٹ میں اپنے ایک حلف نامہ میں وہی باتیں کہیں جو پانڈیا نے ٹریبونل سے کہی تھیں۔ انہوں نے اپنے حلفیہ بیان میں عدالت کو بتایا کہ وزیر اعلیٰ نے پولیس کے اعلیٰ افسران سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اپنا غصہ نکالنے دینے کو کہا تھا۔ یہاں سے شروع

ہوئی سنجیو بھٹ کی شامت یہاں تک کہ ان کو گرفتار کیا گیا، ایک سے زائد تحقیقات کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار یہ سلسلہ ان کی برطرفی پر منتج ہوا۔ آر بی سری کمار اور کئی دوسرے سینئر آئی ایس افسران کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

سنجیو بھٹ کی برطرفی کے بعد انڈین پولیس سروس کے نو منتخب افسران کو ٹریننگ کے لیے اسرائیل بھیجنے کی خبر آئی تو لامحالہ میری آنکھوں میں اسرائلی پولیس اور سلامتی دستوں کے ان افسران اور سپاہیوں کے سفاک چہرے پھر گئے جو معصوم بچوں پر بندوق تانے نظر آتے ہیں، جو اپنی بندوق کی گولیوں سے شیر خوار بچوں کے پرخچے اڑا کر سنگ دلی، بربریت اور بے رحمی کی بہیمانہ تاریخ رقم کرتے ہیں یا پھر جو جعلی دستاویزات پر دور دراز ملکوں کا سفر کرکے فلسطینی رہنماؤں کو قتل کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ان ہی دو کاموں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انسانیت کے خلاف جرائم کا طویل ریکارڈ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ سری کمار، سنجیو بھٹ اور ان جیسے کئی دوسرے پولیس افسران کے چہرے بھی نگاہوں میں گردش کرنے لگے۔ ہمارے پولیس افسروں کی نئی نسل جو اسرائیل سے ٹریننگ لے کر آئے گی وہ کون سی مہارت حاصل کرکے یہاں آتی ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے موجودہ حکمرانوں نے ہندوستان جیسے عظیم ملک اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو اسرائیل جیسے دنیا کے نقشہ پر نقطہ کے برابر ملک کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ اس کا پس منظر ہمارے ہندوتو نواز مفکروں کی صہیونیت نوازی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

دینا ئک دمودر کر جدید ہندو قوم پرستی کے بانیوں میں شامل ہیں۔ ہندوتو، کی اصطلاح اور نظریہ ان ہی کی ایجاد ہے۔ ساورکر نے ۱۹۲۳ء ایک کتاب ہندتوا ہندو کون ہے''؟ Who: Hindutva is a Hindu) لکھی۔ اسی میں ہندو قوم پرستی کے وہ نظریات بیان کیے جن کی بنیاد پر آر ایس ایس اور بی جے پی کا قیام عمل آیا۔ وہ صہیونی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ وہ ہندوؤں کی طرح یہود کو بھی ایک ایسی مظلوم قوم تصور کرتے تھے جو گزشتہ کئی صدیوں سے بقول ان کے مسلمانوں کے مظالم برداشت کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہودیوں اور ہندوؤں کو اب مسلمانوں سے مل کر لڑنا چاہیے۔ ساورکر اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

''اسلام کی آمد سے قبل فلسطین کے سارے علاقے پر یہود بستے تھے۔ وہ ان کا قومی وطن تھا۔ اس لیے اب فلسطین میں یہود کی قومی ریاست بنی چاہیے۔ جب بھی ایسا ہوا تو مجھے یہود کے مانند از حد خوشی ہوگی''۔

ساورکر بیسویں صدی کی ہندو سیاست میں مسلح و پرتشدد تحریک چلانے والے لیڈروں میں شامل تھے۔ وہ انتہا پسند جماعت، ہندو مہا سبھا کے سربراہ رہے۔ گاندھی جی کے قتل میں ملوث رہنے کا الزام ساورکر پر آیا۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر اعظم نریندر مودی ساورکر کو اپنا روحانی رہنما مانتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ان کے طرز فکر کو جاننا آسان ہوجاتا ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسرائیل سے بھرپور تعلقات کیوں چاہتے ہیں؟

یہ وہی اسرائیل ہے جس کے تعلق سے گاندھی جی نے لکھا تھا' مجھ سے اکثر عرب یہودی مسئلے پر رائے پوچھی جاتی ہے۔ یہود بے شک اس وقت اپنا کوئی ملک نہیں رکھتے، مگر انہیں زور زبردستی سے فلسطین پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات انصاف کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی۔ اسی لیے فلسطین میں عربوں کو بے دخل کرکے وہاں یہودی ریاست قائم کرنے کا خیال مجھے نہیں بھاتا۔ اور اس پر صہیونی رہنماؤں اور امریکا نے خاصی ناراضگی ظاہر کی تھی۔ لیکن انصاف تو انصاف ہے جو انسان کے سر چڑھ کر

بولتا ہے۔ ہمارے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے اس موقف اور مظلوم فلسطینیوں کی حمایت کو سرکاری پالیسی بنایا۔ پنڈت نہرو ویسے بھی سیکولر تھے، وہ مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست اسرائیل کے ساتھ نہ چل سکتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان نے ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں قیام اسرائیل کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ امریکی دباؤ کے باوجود ہندوستان کی حکومت ملک میں اسرائیلی سفارت خانہ کھولنے کی اجازت دینے سے انکار کرتی رہی۔ جب بھی اسرائیل فلسطینیوں پر حملے کرتا، تو ہندوستان شدید احتجاج کرتا۔ ہندوستان کے ظاہری رویہ میں ۱۹۹۱ء کے بعد تبدیلی آنا شروع ہوئی جب سویت یونین کے خاتمے سے سرد جنگ بھی اختتام کو پہنچی۔ تب مختلف عوامل کے باعث اسرائیل کی مخالفت حکومت ہند کو بے معنی لگنے لگی۔ اس میں جو گرم جوشی اب دیکھنے کو مل رہی ہے وہ دو ملکوں میں برابری کے رشتے سے آگے کی چیز نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم نے ہندوستان جنت نشان کو صہیونیت کے ہاتھوں گروی رکھ دیا ہے۔

صہیونیت اور ہندوتو میں گہری مماثلتیں ہیں اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دونوں کی قیادتیں ابتدا ہی سے سود خور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں رہی ہیں۔ یہ بھی دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ۱۹۹۰ء کے آس پاس اشتراکیت اور اشتمالیت پہ سرمایہ داری کی فتح سے ان دونوں کی رگوں میں نیا خون دوڑ گیا اور ان کے روابط میں نئی گرم جوشی آ گئی۔ غضب یہ بھی ہوا کہ جہاں بھارت میں اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں بی جے پی اقتدار میں آ گئی وہیں اسرائیل میں انتہا پسندوں کی جماعت لیکود پارٹی کو اقتدار حاصل ہو گیا جس کی قیادت کی باگ ڈور صابرہ شتیلہ کے قصائی ایریل شیرون کے ہاتھوں میں تھی۔ وقت کی اس کروٹ نے دنیا کی دو انتہائی خطرناک تحریکوں کے روابط کو مزید گہرا اور طاقتور بنا دیا یہاں تک نوبت پہنچی کی کہ ہندوستان میں دہشت گردانہ واقعات کی تحقیقات میں مشہور آئی پی ایس افسر ہیمنت کرکرے نے پایا کہ ہندوستان کی فوج کا ایک لفٹننٹ کرنل، اس کے چند فوجی اور غیر فوجی ساتھی اور ہندوتو نواز تنظیموں کے لوگ اسرائیل کی مدد سے ہندوستان کا تختہ پلٹ کر ملک کے اقتدار کو ایک ہندوتو نواز فوجی ٹولہ کو سونپ دینے کی سازشوں پر عمل پیرا تھے۔

اس واقعہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بھارت کو اشتراکیت کے زوال یعنی سقوط ماسکو کے بعد یہ احساس زیادہ شدت سے ہوا کہ فلسطینیوں کی حمایت کرنے سے پچھلے چالیس برس میں اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ملک جہاں کروڑوں مسلمان آباد تھے، پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کی مخالفت کے باعث وہ اسلامی سربراہ کانفرنس (او آئی سی) کا رکن نہیں بن سکا۔ ہمیں عرب ممالک سے یہ بھی شکایت تھی کہ وہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت کرتے ہیں اور پاکستانی حکومت پہ یہ دباؤ نہیں ڈالتے کہ وہ کشمیر میں ''دراندازی'' بند کردے۔ ۱۹۹۱ء میں فلسطینیوں اور اسرائیلی کے مابین میڈرڈ امن معاہدہ نے بھی بھارت کی سوچ کو متاثر کیا۔ ہماری حکومت سوچنے لگی کہ دنیائے عرب اور پی ایل او اب اسرائیل سے مفاہمت چاہتے ہیں، لہذا اسے بھی اسرائیلی حکومت کے خلاف معاندانہ رویہ ترک کر دینا چاہیے۔ یہی وہ عوامل تھے کہ ۱۹۹۲ء میں نرسمہاراؤ کی کانگریسی حکومت نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ اس کے بعد تو عسکری، سائنسی، معاشی اور زرعی شعبوں میں اسرائیل ہند روابط تیزی سے بڑھتے چلے گئے۔ سوشلسٹوں کو بھی صیہونی لابی نے اپنے شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اتر پریش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو سے لکھنو میں ملاقات کر کے اسرائیل کے سفیر

نے زرعی شعبے میں تعاون کی پیکش کرتے ہوئے یوپی کو جنت ارضی بنادینے کی بات کہی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں اسرائیلی صدر ایزر ویزمان نے بھارت کا دورہ کیا۔ تب ہماری فوج کے شدید دباؤ سوشلسٹ وزیراعظم دیوگوڑا نے اسرائیل سے میزائیل خریدنے کا معاہدہ کرلیا اور اگلے برسوں میں اسرائیل ہند قربت ہوا کی رفتار سے بڑھی جب بی جے پی برسراقتدار آ گئی۔

بی جے پی کہنے کو تو ایک قوم پرست جماعت ہے مگر اس کے بیشتر رہنما آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تنظیم کے بانی دامودر ساورکر، ان کے ذہنی وفکری گرو ڈاکٹر بی ایس مونجے، ڈاکٹر کیشو ہیڈگوار، ایم ایس گوالکر وغیرہ ان یہودی رہنماؤں کے خیالات ونظریات سے متاثر تھے جنہوں نے صہیونیت کی بنیاد رکھی۔ ان یہودی رہنماوں میں موسی ہیس (Moses Hess) یہودا الکالی، لیون پنسکر، تھیوڈور ہرزل اور ولادمیر جابوتینسکی نمایاں ہیں۔ جس طرح صہیونیت کے بانیوں نے یہ وکالت کی کہ فلسطین صرف یہود کا ہے، چنانچہ عربوں کو وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اسی طرح آر ایس ایس کے رہنماؤں کی بھی خواہش چلی آرہی ہے کہ مسلمان بھارت سے نکل جائیں یا ''ہندو سپریمیسی'' قبول کرلیں۔ یہی نظریاتی مطابقت اسرائیلی اور بی جے پی حکومتوں کو قریب لے آئی اور یہ قربتیں ہر دن بڑھ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اب ملک کے ان دماغوں کو جو حقیقت میں ملک کا نظام چلاتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اقتدار کی اصل باگ ڈور ہوتی ہے ان کی تربیت کے لیے ان کو اسرائیل بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر ہمارے نومنتخب آئی پی ایس افسروں کو ملک میں امن وقانون کی حکمرانی قائم کرنے کے کون سے گر ہیں جو وشوگرو بھارت ان کو نہیں سکھا سکتا۔ کیا ہمارے پاس چانکیہ کی سیاست نہیں ہے یا چندگپت موریہ کی جرأت وشجاعت اور ذہانت و دانشمندی نہیں؟ ہم اسرائیل سے کیا سیکھ رہے ہیں یا کیا لے رہے ہیں اس کا واضح اشارہ اس واقعہ میں موجود ہے کہ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیاں فلسطینیوں پہ اسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لانا چاہتی تھیں مگر بی جے پی سے سے تعلق رکھنے والے اسپیکر نے اجازت نہ دی۔ پچھلے ۶۳ برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے حکمراں مظلوم فلسطینیوں سے اظہار یکجہتی نہ کرسکے۔ یہی نہیں، بی جے پی کی شہ پر ہندو قوم پرستوں نے کلکتہ میں اسرائیل کی حمایت میں جلوس نکالا۔ یوں مودی حکومت کے عمل سے ثابت ہوگیا کہ دنیا میں امریکا کے بعد بھارت ہی اسرائیل کا قریب ترین دوست ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب ۱۹۶۹ء میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی، را کی بنیاد رکھی گئی تو اندرا گاندھی نے اس کے چیف رامیشور ناتھ کاؤ کو حکم دیا کہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی، موساد سے رابطہ کریں۔ بھارتی وزیراعظم کی خواہش تھی کہ بھارتی جاسوسی کے شعبے میں موساد کے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ اسرائیل چاروں طرف سے دشمنوں (اسلامی ممالک) میں گھرا ہوا ہے۔ اسی لیے اسرائیلی حکومت شروع سے دفاع اور جاسوسی کے شعبوں میں وسیع پیمانے پر تحقیق و ترقی (ریسرچ اینڈ ڈیلپمنٹ) کرانے لگی۔ ان دونوں شعبوں پہ اربوں ڈالر خرچ کیے گئے نتیجتاً آج اسرائیل چوٹی کے سائنس داں و دیگر ہنرمند رکھتا ہے جو رات دن جدید ترین اسلحہ بنانے میں منہمک رہتے ہیں۔ حتی کہ امریکی ماہرین عسکریات بھی نت نئے ہتھیار بنانے میں اسرائیلیوں سے مدد لیتے ہیں۔ دور جدید کا مہلک ترین ہتھیار، ڈرون بنیادی طور پر اسرائیلی ایجاد ہی ہے۔ یہودی سائنسدانوں کے تجربات اور ایجادات سے فائدہ اٹھانا ایک بات ہے لیکن اس کے نظریات کو اپنالینا اور اس کے قدموں میں

سرڈال دینااور بات۔

صہیونیت کی تاریخ ویسے تو یورپ کے ملکوں سے یہودیوں کو نکالے جانے کے واقعات سے شروع ہوتی ہے اور غالباً اس سلسلے کا پہلا واقعہ پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسپین میں پیش آیا لیکن جدید صہیونیت کا بانی آسٹریلیائی ہنگرین صحافی تھیوڈور ہرزل ہے جس نے ۱۸۹۶ء میں اپنی کتاب ''ریاست یہود'' شائع کی اور اگلے سال پہلی صہیونی کانگریس بلائی۔ اس کے بعد یوروپ کے ملکوں میں بکھرے ہوئے یہودیوں میں فلسطین کے شہروں میں آ آ کر بسنے کی تحریک تیز ہوئی اور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک چالیس ہزار یہودی یہاں آبسے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے کہ بعض مذہبی اساطیر کو بنیاد بنا کر ایک خاص نسل کے لوگوں کو دنیا کے درجنوں ملکوں میں یہ بتایا گیا کہ تمہارا قومی وطن دنیا کے ایک دوسرے کونے میں ہے اور جن ملکوں میں تم پیدا ہوئے یا تمہارے باپ دادا جہاں صدیوں سے رہتے چلے آئے ہیں وہ تمہارا اصلی اور حقیقی وطن نہیں ہے۔ پھر ان کو وہاں سے طرح طرح کی تحریص وترغیب دے کر یہاں لانے کی تحریک چھیڑی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں آ گیا اور ارض اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست کے قیام کی تحریک نے زور پکڑا تو اس کا ردعمل ہونا عین فطری تھا، وہ بھی ہوا لیکن اس تحریک کو برطانیہ کی سرپرستی نے ہر ممکن تقویت پہنچائی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے جو پہلا بڑا کام کیا وہ فلسطین کی تقسیم کے پلان کی توثیق تھی۔ نازیوں اور فاشسٹوں کے مظالم کے شکار یہودیوں کے لیے ہمدردی کی ایسی فضا پیدا کی گئی تھی کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم فلسطین کے پلان کو منظور کرنے کی سفارش کی اور ۱۴ر مئی ۱۹۴۸ء کی آدھی رات کو برطانیہ نے نہ صرف ارض فلسطین سے اپنے اقتدار کے خاتمہ کا اعلان کر دیا بلکہ اسرائیل کو ایک نئے ملک کی حیثیت سے منظوری بھی مل گئی۔ اقوام متحدہ کے اعلان میں اگرچہ فلسطین اور اسرائیل کی سرحدیں طے تھیں اور بیت المقدس (یروشلم) کو ایک بین الاقوامی خطہ کے طور پر ان دونوں سے الگ رکھا گیا تھا لیکن صیہونی تحریک کے کسی بھی دستاویز میں ارض اسرائیل کی سرحدیں متعین نہیں ہیں۔ بن گوریان سے نتن یاہو تک اسرائیلی حکمرانوں نے اپنی توسیع پسندانہ جارحیت کا سلسلہ دراز رکھا ہوا ہے اور دنیا پر حکمرانی کے خواب کی تعبیر دیکھنے کو بیتاب نظر آتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ہتھیاروں کی تجارت اور اسلحہ کی صنعتوں کو وسیلہ بنایا ہے اور ہندوستان روز اول سے ان کا نشانہ رہا ہے۔ اسرائیل نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہی ہندوستان سے گہرے عسکری روابط استوار کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن اس کو اس میں کامیابی ۲۲ر برسوں کے بعد ۱۹۷۱ء میں ملی۔ اسرائیل اور حکومت ہند کے مابین پہلا عسکری رابطہ ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ تب اسرائیلی حکومت نے ہندوستان کو پیش کش کی کہ وہ چین کے خلاف جنگ میں اس کی عسکری مدد کرنے کو تیار ہے۔ ۱۹۶۵ء میں بھی اس نے ہند پاک جنگ کے دوران ہندوستان کی کھلی حمایت کی تھی۔ ہماری حکومت نے ۱۹۷۱ء میں اسرائیلی اسلحہ قبول کر لیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن چند توپوں اور راکٹوں کی سپلائی سے شروع ہونے والا سلسلہ اربوں کھربوں کی تجارت تک جا پہنچا اور اب اسرائیل ہندوستان کو دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ اسلحہ بیچنے والا ملک ہے۔

سری ناتھ راگھون سینٹر فار پالیسی ریسرچ نئی دہلی سے وابستہ محقق اور دفاعی سائنس کے ماہر ہیں۔ کچھ عرصے قبل ان

کی کتاب ''۱۹۷۱: بنگلہ دیش کی تخلیق کی ایک عالمی تاریخ'' (1971: A Global History of the Creation of Bangladesh) شائع ہوئی تھی۔ کتاب لکھنے کے دوران سری ناتھ کو پرمیشور نارائن بکسر کے کچھ ذاتی کاغذات دیکھنے کا موقع ملا جو نہرو میموریل میوزیم و لائبریری (دہلی) میں محفوظ ہیں۔ بکسر معروف سفارت کار تھے جو ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۳ء وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پرنسپل سیکریٹری رہے۔ قیام بنگلہ دیش میں بکسر نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ متذکرہ کاغذات افشا کرتے ہیں کہ جون ۱۹۷۱ء میں اسرائیلی حکومت نے فرانس میں متعین سفیر ہنڈڈی این چٹر جی سے رابطہ کیا۔ چٹر جی کو بتایا گیا کہ حکومت ہند چاہے تو پاکستان سے متوقع جنگ کے لیے اسرائیل سے اسلحہ حاصل کر سکتی ہے۔ چٹر جی نے ٹاپ سیکرٹ خط کے ذریعے یہ اطلاع اندرا گاندھی کو بھجوائی جو انہیں ۶ جولائی کو موصول ہوا۔ اندرا گاندھی نے یہ اسرائیلی پیش کش قبول کر لی۔ اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر نے فوراً شلومو زلودوگز (Shlomo Zabludowicz) سے رابطہ کیا۔ لکسمبرگ میں رجسٹرڈ اس یہودی صنعت کار کی کمپنی سولتام (Soltam) اسرائیلی فوج کو توپیں، بکتر بند گاڑیاں، مارٹر اور متعلقہ گولہ بارود فراہم کرتی تھی۔ طے پایا کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی، را اور اسرائیلی موساد کے تعاون سے سولتام اسرائیلی ساخت کی توپیں، مارٹر اور گولے بھارت بھجوائے۔ یہ سارا جدید ترین اسرائیلی اسلحہ اگست ۱۹۷۱ء تک بھارت پہنچ گیا۔ سری ناتھ نے اپنی کتاب میں را کے سربراہ، آر این کاؤ کا ایک نوٹ بھی شامل کیا ہے۔ وہ انکشاف کرتا ہے کہ اسرائیلی مارٹر اور متعلقہ گولے مکتی باہنی کے گوریلوں کو دیئے گئے جبکہ توپیں اس ہندوستان کی فوج کو دی گئیں جسے مشرقی پاکستان میں پاک افواج سے بنرد آزما ہونا تھا۔ اسرائیلی وزیر اعظم گولڈ امیئر نے شلوموز بلودوکز کی وساطت سے اندرا گاندھی کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ اسلحہ فراہم کرنے کے بدلے بھارت میں اسے سفارت خانہ کھولنے کی اجازت دی جائے۔ تاہم بھارت ابھی عرب و اسلامی دنیا کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسرائیلیوں کو یوں خوش کیا گیا کہ انہیں بھارت میں دو ایٹمی تجربات کرنے کی اجازت مل گئی۔ جو مئی ۱۹۷۴ء میں بھارت کے ایٹمی تجربات کے ساتھ انجام پائے تھے۔ یہ سلسلہ کارگل جنگ کے دوران مزید دراز ہوا، اس کے بعد مختلف اقسام کے اسرائیلی اسلحے دھڑا دھڑ ہندوستان پہنچنے لگے۔ ایک رپورٹ کی رو سے ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۹ء اسرائیل نے ہندوستان کو ۳۰ / ارب ڈالر (تیس کھرب روپے) کی خطیر رقم کا اسلحہ فروخت کیا۔ یوں اسرائیلی اسلحہ ساز کمپنیوں نے صرف ایک عشرے میں اربوں ڈالر کمایا۔

بے شک ہمارے موجودہ حکمرانوں کی جماعت بھی ہندوتو کے اسی فکر و فلسفہ پر اعتقاد رکھتی ہے جس میں ارض اسرائیل پر اسرائیل کے بیٹوں کی طرح بھارت پر بھی ماتا کے بیٹوں کا ہی حق ہے، جس طرح صہیونیوں کے ارض اسرائیل کی سرحدیں طے نہیں ہیں، اسی طرح ان کے تصور کا بھارت بھی کہاں سے کہاں تک ہے کسی کو نہیں معلوم، یہ بھی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے جس کو اقوام متحدہ نے منظوری دی ہوئی ہے، لیکن ان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ صہیونیت کی اسی سوچ نے دنیا کا امن غارت کر رکھا ہے اور فلسطین اگر آج بھی دنیا کا خطرناک ترین فلیش پوائنٹ ہے تو اس کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے اور یہ کہ اسلحہ کی تجارت اور تشدد کی ذہنیت کو فروغ دینا کہیں کی دانشمندی نہیں۔

☆☆☆

ادراک حقیقت

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے

(ریل کے خطرناک حادثہ میں دعا کی برکت سے بچنے والے مسافروں کی کہانی)

محمد الیاس ندوی بھٹکلی
nadviacademy@hotmail.com

موت کے منہ میں جاکر واپس آنے کا محاورہ سنا تو تھا لیکن دیکھا نہیں تھا، ۲۲/ جولائی ۲۰۰۳ء کو کوکن ریلوے کے ایک خطرناک حادثہ میں نہ صرف اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ سے واپس آتے دیکھا بلکہ میں خود بھی واپس آیا، اللہ جسے بچانا چاہے اور اس کی زندگی کا آب ودانہ باقی رکھے تو اسے وہ فضا کی بے پناہ بلندیوں سے گراکر بھی محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ تین سال قبل روس کی فوج کا ایک جرنل بائیس ہزار فٹ کی بلندی سے جہاز کے ایک حادثہ کے بعد گر کر بچ گیا، ۷/ جولائی ۲۰۰۳ء کو سوڈان ایرویز کا ایک ہوائی جہاز ہزاروں فٹ اوپر فضا کی بلندیوں سے پھٹ کر گرا اور اس میں موجود تمام ایک سو چودہ مسافر ہلاک ہوئے صرف ایک دوسالہ بچہ بچ گیا، عالم اسلام کی مشہور درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیمات اور برصغیر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی چند سال قبل دہلی سے بریلی جانے والی ٹرین پر سے اس طرح گرے کہ پلیٹ فارم کی دیوار اور ٹرین لائن کے درمیان پٹری پر وہ چت پڑے ہوئے تھے اور ان پر سے ٹرین گزر رہی تھی، مولانا شوگر کے مریض تھے اور بائی پاس آپریشن بھی ہو چکا تھا، ٹرین والوں نے یہ دیکھ کر چلانا شروع کیا کہ ملاّ جی کٹ گئے، لیکن اللہ کو بچانا مقصود تھا، نہ صرف بچایا بلکہ جسم پر کوئی خراش تک نہیں تھی اور نہ کوئی عضو متاثر تھا، اسی طرح کسی کی مدت حیات ختم ہو جائے تو فٹ دو فٹ کے فاصلہ سے گر کر اور زخمی نہ ہو کر بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سابق ناظم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ندوۃ العلماء میں میرے زمانہ طالب علمی کے دوران لکھنؤ میں سائیکل رکشہ سے اس وقت گرے جب ایک گائے سامنے آگئی اور رکشہ والے نے بریک لگایا وہ دو ڈھائی فٹ اوپر سے گرے، نہ زخم نہ خراش لیکن اسی وقت جان بحق ہوئے، ۲۲/ جولائی ۲۰۰۳ء کو ہندوستان میں مغربی ساحل پر سات آٹھ سال قبل شروع ہوئے کوکن ریل کے اب تک کے سب سے بڑے ریلوے حادثہ سے خود ہم لوگ دوچار ہوئے لیکن اللہ نے حیرت انگیز طریقہ پر اپنی قدرت ورحمت کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ہم سے متصل ڈبے والے درجنوں لوگوں نے اسی وقت زخموں کی تاب نہ لاکر داعی اجل کو لبیک کہا اور ہم فضل خداوندی سے محفوظ ومامون رہے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں ششماہی کی چھٹیوں میں مہاراشٹرا اور گجرات کے مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل کے ایک دعوتی دورہ پر دس اساتذہ پر مشتمل ایک وفد مہتمم جامعہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی قیادت میں روانہ ہوا جس میں مولانا مقبول صاحب ندوی، مولانا شعیب صاحب ندوی، مولانا انصار صاحب ندوی، مولانا اسامہ صاحب ندوی،

مولانا افضل صاحب ندوی مولانا بشیر صاحب ندوی، مولانا ابرار صاحب ندوی اور مولانا عبدالسمیع صاحب ندوی تھے، اتوار کا دن تھا، ہم لوگ دوپہر کو رتنا گیری مہاراشٹرا جانے کیلئے اپنے ضلع کے ہیڈکوارٹر کاروار اسٹیشن بذریعہ سوموپہنچے ، چونکہ ہمارا ریزرویشن نہیں تھا اور سفر بھی دن میں اور وہ بھی صرف پانچ چھ گھنٹے کا تھا اس لئے ہم لوگ کاروار ممبئی ہالی ڈے اسپیشل ٹرین کی جنرل بوگی میں جو پوری خالی تھی آرام سے بیٹھ گئے اور الگ الگ سیٹوں پر لیٹنے کیلئے اپنا سامان رکھ دیا، چونکہ ٹرین کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی تھی اس لئے ہمارے کچھ ساتھی چائے لانے کیلئے ٹرین سے اترے اور کینٹین کا رخ کیا جہاں ایک ٹی ٹی کی نگاہ ہم پر پڑی ، اس نے ہم سے پوچھا: آپ لوگ کہاں جارہے ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں، تفصیل سن کر بڑی لجاجت کے ساتھ اس نے کہا: آپ لوگ پیچھے میری ریزرویشن والی بوگی میں آجایئے، ہم نے اس کی بات سنی ان سنی کردی لیکن دوبارہ جب جب بھی اس کے سامنے سے ہم گزرے وہ بار بار یہی کہتا رہا کہ آپ لوگ پیچھے میری خالی بوگی میں کیوں نہیں آتے، جب اس کا اصرار بڑھا تو ہم لوگوں نے واپس اپنے کوچ میں جاکر مشورہ کیا، اکثر ساتھیوں کی رائے تھی کہ یہاں سے منتقل ہونے کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ بوگی خالی ہے، آرام سے لیٹ کر وقت کٹ جائے گا لیکن بعض ساتھیوں کے اصرار پر بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس ٹی ٹی کی بوگی میں چلے جائیں، خواہی نہ خواہی ہم لوگ اس ٹی ٹی کے کوچ میں آگئے، گاڑی چلی، ہم لوگوں نے سفر کی دعا پڑی، مغرب کا وقت ہوگیا، چونکہ ہم مسلکاً شافعی تھے اس لیے نماز کے متعلق اکثر ساتھیوں کا خیال تھا کہ رتنا گری پہونچ کر جمع تاخیر کرلیں گے لیکن بعض دوستوں نے اول وقت میں ہی جمع تقدیم کرلی، جو ساتھی نماز پڑھنے سے رہ گئے تھے ان کو ایک ساتھی نے یہ کہہ کر کہ زندگی کا کیا بھروسہ ابھی نماز سے فارغ ہوجائیں جمع تقدیم ان سے بھی کروالی، ہم لوگ نماز سے فارغ ہوئے، سب دوستوں نے اپنی اپنی سیٹ پر اپنے معمولات اوراوراد ووظائف مکمل کرلئے، دوبارہ مجلس جمی، یادوں کے دریچوں سے پرانے تذکروں، تفریحی گفتگو اور قومی مسائل کا سلسلہ پھر چل پڑا، یہاں تک کہ شب کے نو بجنے لگے، ٹرین سے باہر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، سخت اندھیرا تھا، موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ فی گھنٹہ پچھتر کلومیٹر کے حساب سے وائی بھاؤواڑی اور راجہ پور اسٹیشن کے درمیان اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی، اسی دوران کیا دیکھتے ہیں کہ اچانک ہماری بوگی لڑکھڑانے لگی، دس پندرہ سکینڈ تک یہ سلسلہ جاری رہا، سیٹ پر آمنے سامنے بیٹھے ساتھی ایک دوسرے پر گر گئے اور ایسا محسوس ہوا کہ کسی کھائی میں آہستہ آہستہ ہماری ٹرین اوندھے منہ گر رہی ہے، سب کی زبان سے بے ساختہ بڑی آواز سے کلمہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں، اور یا اللہ یا اللہ کی صدا ہر طرف سے سنائی دینے لگی، کچھ وقفہ کے بعد گارڈ نے بریک لگایا اور ٹرین رک گئی، کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا، کچھ ساتھی دوڑے دوڑے باہر دروازہ کی طرف بھاگے اور نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن پٹریوں پر کمر تک پانی تھا اور گھپ اندھیرا، اس پر بارش کا نہ رکنے والا سلسلہ ، مسافروں میں سے کسی نے آواز لگائی کہ کچھ نہیں ہوا ہے، کسی نے زنجیر کھینچ دی ہے، اس لئے ایمرجنسی بریک لگے ہیں جس سے جھٹکے محسوس ہوئے ہیں اور ٹرین رکی ہے، تھوڑی دیر ہی میں ٹرین چلنے لگے گی، آپ سب اپنی اپنی نشستوں پر دوبارہ بیٹھ جائیں، دس پندرہ منٹ تک ہم لوگ بھی یہی سوچ کر اپنے ساتھیوں کو بھی نیچے اترنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے رہے، کچھ دیر کے بعد ہمت کرکے بائیں طرف سے دروازہ کھول کر کے دیکھا تو عجیب نظارہ تھا، سامنے پہاڑ تھا جس پر ٹرین چڑھ گئی تھی اور ہم سے متصل

اگلا اے سی ڈبہ خوددوسرے ڈبہ پر چڑھ گیا تھا، ایک دوسروں کو آوازیں دی جانے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اکثر ساتھی اورٹرین کے دوسرے مسافر نیچے اترے، جب پٹریوں پر موجود کمر تک پانی پار کر کے آگے بڑھنے لگے تو انہیں پانی میں لاشیں ملیں، سب سے پہلے آٹھ نو ماہ کے معصوم بچہ کی ایک لاش ملی، اس کے بعد ایک عورت کی، آگے بڑھتے ہوئے یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا، بارہ تیرہ لاشیں خود ہمارے ساتھیوں نے ہمارے ڈبہ میں پہونچائیں، بڑا عجیب قیامت کا منظر تھا، سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ جنرل بوگی جس میں ہم لوگ کچھ گھنٹوں پہلے سوار تھے اور ٹی ٹی نے ہمیں جہاں سے بڑی منت سماجت سے اٹھوا کر اپنے کوچ میں بٹھایا تھا وہ پوری طرح کٹ کر ایک دوسرے میں گھل مل کر ناقابل شناخت ہوگئی تھی، کچھ دیر پہلے جن سیٹوں پر ہم بیٹھے ہوئے تھے اس میں صرف بکھری لاشیں تھیں، مدد مدد کی چیخ وپکار تھی، کسی کا ہاتھ کٹ گیا تھا اور کسی کا پیر، کسی کا سر ایک طرف تھا تو دھڑ دوسری طرف، ہمت کر کے ہمارے ساتھی گھپ اندھیرے کے باوجود زخمیوں کو بڑی احتیاط سے نکالنے لگے اور لاشوں کو چادروں میں لپیٹ لپیٹ کر اوپر پہونچانے لگے، مسلسل گھنٹہ بھر کام کرنے سے سب کی ہمتیں جواب دینے لگیں، اسی دوران پیچھے سے ریلوے کمک پہنچ گئی اور ہم لوگوں کو مع لاشوں اور زخمیوں کے پیچھے کے ان ڈبوں میں جو صحیح سلامت بچ گئے تھے سوار کر کے واپس کنکولی اسٹیشن لے گئی جہاں پہلے سے اطلاع ملنے کی وجہ سے ایمبولینس اور پولس فورس وغیرہ موجود تھی، دوسرے دن بمبئی پہنچ کر اخبارات سے سرکاری اطلاع کے مطابق ہمیں معلوم ہوا کہ جملہ باون لوگ جان بحق ہوئے اور سو کے قریب زخمی، اس میں اکثریت جنرل بوگی کے مسافروں کی تھی، حادثہ کی وجہ یہ تھی کہ ہماری ٹرین جب پٹری پر پچھتر کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی تو رتناگری سے ایک کلومیٹر دور ڈرائیور نے دور سے ایک چٹان کو پٹری پر گرا ہوا پایا جو قریب کے پہاڑ سے موسلا دھار بارش کی وجہ سے تھوری دیر پہلے پٹری پر گر گئی تھی حالانکہ پندرہ منٹ پہلے اسی پٹری پر دوسری ٹرین گزر چکی تھی، اچانک ڈرائیور نے جب پٹری پر چٹان کو گرا دیکھا تو اس نے ٹرین کو روکنے کی کوشش میں بریک لگائے جس سے سب سے پہلے انجن والی بوگی پٹری سے اتری اور گری اور اس سے متصل ہم سے اگلی چاروں بوگیاں ایک دوسرے پر چڑھ گئیں اور یہ خطرناک حادثہ پیش آیا، جس حیرت انگیز طریقہ پر اللہ نے ایک ٹی ٹی کو ذریعہ بنا کر اس ٹکڑے ہونے والی جنرل بوگی سے ہمیں اٹھا کر اپنا فضل فرمایا اس کو دیکھ کر ہم سب کی زبانوں سے بے ساختہ یہ نکلا کہ یہ سفر کی اسی دعا کی برکت تھی جس کے پڑھنے پر حدیث شریف میں یہ پیشن گوئی کی گئی ہے کہ اس کا پڑھنے والا پورے سفر میں اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے اور اسی کی نگہبانی میں، اللہ ہی اس کیلئے کافی ہوتا ہے اور ہر شر سے اسکو وہ محفوظ بھی رکھتا ہے، اس کا اعلان فرشتوں کے ذریعہ بھی ہوتا ہے اور انسان اپنی آنکھوں سے بھی اس کے اثرات دیکھتا ہے، وہ دعا ہے : **بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ** کہ میں نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، تمام طاقتوں وقوتوں کا مالک اور سرچشمہ وہی تنہا ہے، سفر کی اس دعا **سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ** کی برکت سے سینکڑوں نہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو اللہ جس طرح محفوظ رکھتا ہے اس کے مظاہر ہر جگہ روز ہمیں نظر آتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان روزمرہ کی ان مسنون دعاؤں کی سفر حضر، اٹھتے بیٹھتے اہتمام سے پابندی کرے جس کے اثرات خود اس دنیا ہی میں اللہ تعالی دکھا دیتے ہیں اور اس کے پڑھنے پر جو آخرت میں ملنے والا ہے اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

شخصیات

پروفیسر رفیع احمد علوی مرحومؒ

عبید اقبال عاصم
ubaidIqbalasim@gmail.com.

موت کے بے رحم ہاتھوں کے سامنے کون ذی روح کس وقت بے بس ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا، یوں تو ہر حیات کا مقدر موت ہے لیکن جو افراد اس حیات کے پنجرے میں بہ توفیق الٰہی کچھ قابل تقلید کام کر جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی وجود کے پیوندِ خاک ہونے کے باوجود کم از کم ایک نسل کے ذہنوں میں عرصۂ دراز تک اپنی حیات کے نقوش مرتسم کیے رکھتے ہیں۔

پروفیسر رفیع احمد علوی صاحب مرحوم اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے دینی مزاج، عمل صالح اور علم نافع سے خود بھی مستفیض ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی فیض پہنچانے کی کوشش کرتے۔ علوی صاحب مرحوم کا نام تو گوشۂ سماعت میں علی گڑھ آنے کے بعد ہی محفوظ ہو گیا تھا لیکن ان سے ملاقات ان کی شخصیت کو جاننے اور ان کی شفقتوں کا مشاہدہ تقریباً گزشتہ پندرہ برسوں قبل اس وقت سے شروع ہوا جبکہ راقم الحروف سرسید نگر میں بحیثیت کرایہ دار مقیم ہوا۔ علوی صاحب مرحوم اگرچہ میرے قریبی پڑوسی نہیں تھے لیکن ان سے تعارف میرے بیٹوں کے واسطے سے ہوا جو سرسید نگر کی مکی مسجد میں قرآن مجید پڑھنے جاتے تھے۔ علوی صاحب مرحوم قرآن کریم سے انتہائی شغف رکھنے کے باعث ان بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے جو قرآن مجید کے تئیں سنجیدہ ہوں۔ قرآن مجید کی برکت سے میرا مرحوم سے تعلق ہوا۔ جب انہیں میری ان نسبتوں کے بارے میں معلوم ہوا جو دینی شناخت میں معاون ہوتی ہیں تو ان کا تعلق کچھ اور بڑھا اور جب انھیں یہ پتہ لگا کہ یہ ''گھامڑ'' قرطاس وقلم کی شد بد بھی رکھتا ہے تو انھوں نے اپنے دست شفقت کو اور وسیع کر دیا، جس سے ان کی محبتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سرسید نگر سے وادی اسماعیل منتقل ہونے کے بعد اگرچہ ملاقاتوں کے اس سلسلے میں کچھ کمی آ گئی جو تقریباً روزمرہ کے معمولات میں سے تھا تاہم موبائلی گفتگو کا سلسلہ طویل علالت کے زمانہ تک جاری رہا۔

علوی صاحب مرحوم، بے انتہا خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ کتابوں کے شیدائی، مطالعہ کے رسیا اور صالح فکر کے دلدادہ تھے۔ اخیر عمر میں تو انہیں یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اللہ کے بندوں کو وہ اس بھیانک عذاب سے بچالیں جس کی ہولناکی و

غضب ناکی کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔اس کے لیے انھوں نے جو کوششیں عملی طور پر کیں اس کی توقع ایک پروفیسر سے تو کیا یونیورسٹی سے وابستہ درجہ چہارم کے ملازم سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ان کا انداز جداگانہ تھا۔وہ اصلاحی مضمون لکھتے۔اس کو یا تو چھپواتے یا پھر زیروکس کرواتے اور پھر صرف اپنے محلے کی ہی نہیں بلکہ دیگر محلوں کی مسجدوں کے دروازوں پر کھڑے ہوکر نماز کے بعد خود تقسیم کرتے۔لوگوں کے گھر گھر جا کر وہ پمفلٹ پہنچاتے۔بچوں کو پکڑ پکڑ کر سناتے اور انھیں وہ اصلاحی لٹریچر دیتے۔کوشش یہی ہوتی کہ کسی بھی طرح اللہ کی مخلوق جہنم کی آگ سے محفوظ و مامون ہوکر جنت کے خوشحال باغوں کی سیر کرنے لگے، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ان سے کہا گیا کہ آپ اتنی زحمت نہ کیا کریں اس کام کو ہم جیسے سیاحین کو سونپ دیں لیکن وہ اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوئے۔اس کام میں نہ انھیں کوئی شرم محسوس ہوتی اور نہ ہی کوئی عار۔

کتابیں پڑھنا اور خرید کر پڑھنا مرحوم کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب بھی انھیں معلوم ہوتا کہ میں دیوبند جانے والا ہوں تو فوری طور پر میرے پاس تشریف لاتے اور اپنی فرمائش کے مطابق کچھ کتابوں کے نام اور پیشگی نقد روپیہ دے کر کتابیں منگاتے۔ میں یہ کوشش کرتا کہ کتابیں ان کے گھر تک پہنچا دوں تو اس سے سختی سے منع فرمادیتے اور اپنی گاڑی میں، کبھی کبھار کاندھے پر رکھ کر اپنے گھر تک لے جاتے۔بعض اوقات کتابوں کا بھاری بنڈل اٹھانے میں انھیں پریشانی ہوتی لیکن وہ اس میں کسی بھی قسم کی مدد لینا گوارہ نہیں کرتے تھے۔کتابوں کے تعلق سے اگر مرحوم کو یہ معلوم ہوجاتا کہ فلاں کتاب مختصر سے صفحات میں چھپی ہوئی ہے اور وہ عوام کے لیے بہت زیادہ مفید ہے تو اسے ہزاروں کی تعداد میں خریدتے اور پھر مسجد مسجد تقسیم کرتے۔

علوی صاحب مرحوم فقہی مسائل کے تئیں انتہائی سنجیدہ تھے۔انھیں جب کوئی بات مستند معلوم ہوجاتی تو وہ اپنی رائے کو بدلنے میں کوئی تأمل نہیں کرتے تھے۔مرحوم اپنے گھٹنوں کی بیماری کے باعث کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اس میں علماء نے گنجائش نکالی ہے اوہ اس کا التزام کرتے۔ایک دن مجھ سے اس مسئلہ پر بات چیت ہوئی تو میں نے بتایا کہ ''میرے خیال میں کرسی سے زیادہ بہتر بیٹھ کر نماز پڑھنا ہے'' مرحوم نے فوری طور پر استفتاء ترتیب دیا، دارالعلوم دیوبند کے مفتیانِ کرام نے کرسی کے مقابلے بیٹھ کر پڑھنے کو مناسب ترین قرار دیا تو مرحوم نے اپنے سابقہ عمل سے رجوع کر کے نیچے بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کردی حالاں کہ اس میں بھی انھیں بہت زیادہ دقت پیش آتی تھی لیکن مرحوم نے اسے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور پھر یہی نہیں بلکہ اس فتوے کی سیکڑوں زیروکس کاپیاں عوام وخواص میں تقسیم کیں تاکہ لوگوں کو صحیح صورت حال کا علم ہوسکے۔

بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت ان کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ خود تو صاحب اولاد نہیں تھے لیکن محلّہ کے بچوں سے بے انتہا شفقت کرتے۔انھیں وقتاً فوقتاً مسائل بتاتے۔نماز پڑھنے میں ہونے والی غلطیوں پر متنبہ کرتے۔قرآن شریف کی تعلیم سے بہت زیادہ خوش ہوتے۔ وہ بچوں کو اس کے تئیں اکساتے۔میرا بڑا بیٹا حفظ قرآن کی دولت سے فیض یاب ہوا تو انھوں نے ہدیہ میں ایک بہت خوبصورت قیمتی قرآن مجید عطا کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ اس میں تلاوت کیا کرے تاکہ مجھے

بھی ثواب حاصل ہوسکے، چھوٹے بیٹے کے متعلق باتوں ہی باتوں میں انھیں معلوم ہوگیا کہ وہ اسلامی تاریخ کا شوقین ہے تو اُسے بہت ساری چھوٹی چھوٹی ایسی کتابیں فراہم کیں جن میں اسلام، اس کے متعلقات، دیگر مذاہب اور بزرگ ترین مسلم علماء، صوفیاء، صحابہ کرام وغیرہ کے واقعات دلچسپ، سبق آموز کہانیوں پر مشتمل تھے۔ اور پھر یہ سلسلہ صرف ایک بار کے لیے ہی نہیں بلکہ وہ جب بھی آتے کوئی نہ کوئی ایسی کتاب لاتے جو بچے کی دل چسپی کا مظہر بھی ہوتی اور نصیحت آموز بھی۔ اردو وانگریزی کی بیشتر کتابوں سے الحمدللہ بچے کی ذہن سازی میں بہت زیادہ معاونت ملی۔

علوی صاحب کا ایک اور وصف ان کی امتیازی ضیافت تھی۔ مرحوم دوسری ملی تنظیموں سے میل ملاپ رکھنے کے ساتھ ساتھ تبلیغی جماعت سے خصوصاً مناسبت رکھتے تھے۔ محلّہ میں کسی بھی جگہ سے کوئی تبلیغی جماعت آتی تو اس کی ضیافت اپنا فریضہ تصور کرتے لیکن بیگم صاحبہ سے بے انتہا محبت کے باعث ایسے مواقع پر وہ کبھی ان پر بار نہیں ڈالتے تھے بلکہ یا تو عمدہ لذیذ کھانے کا انتظام بازار سے کرتے یا پھر اشیائے خورد ونوش معہ جملہ لوازمات کے لاکر تبلیغی جماعت کے حوالے کردیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اس کام میں محلّہ کے ذی اثر تبلیغی جماعت کے ذمہ داران کی خواتین کو زحمت دیتے۔ اس طریقہ پر وہ اپنے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ علماء سے ملنے کا اشتیاق ان کے یہاں حد درجہ تھا۔ دیوبند سے میرے گھر پر کوئی عالم دین آتے تو معلوم ہونے پر از خود حاضر ہوتے اور بہت سے مسائل دریافت کرتے، قرآن وحدیث کے مفاہیم کو سمجھتے، بہت سی آیات کی مبہم تشریحات کی توضیح کراتے۔ ایسے حضرات کی ضیافت کے لیے وہ کبھی چائے ناشتے کا سامان خود اپنے گھر پر کرتے۔ جہاں قسم قسم کی مٹھائیوں اور مشروبات سے تواضع کی جاتی۔ ایسا موقع نہیں ملتا تو علمائے کرام کی خدمت میں مٹھائی بطور تحفہ پیش کرتے۔ اگر کبھی اتفاق سے انھیں بعد میں کسی عالم دین کی آمد کا پتہ لگتا تو کفِ افسوس ملتے ہوئے راقم سے ناراضگی کا اظہار بھی ضرور کرتے۔

معاونت وتعاون کا جذبہ بھی علوی صاحب مرحوم کے یہاں جداگانہ تھا۔ وہ بظاہر تو اس وصف سے متصف نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن اگر انھیں کسی ضرورت مند کے بارے میں معلوم ہوجاتا تو وہ اس کی اس انداز سے مدد کرتے کہ اس پر ''دایاں ہاتھ دے اور بائیں کو اطلاع نہ ہو'' کی تعریف پوری طرح صادق آتی۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں راقم سے مشورہ کرکے مالی حالات اور دیگر کوائف کے بارے میں جب انہیں اطمینان قلب ہوجاتا تو خاموشی سے اس کے گھر جاکر اس کی ضروریات کا سامان مہیا کرتے یا پھر نقد دے دیتے اور لطف یہ کہ ایسے مواقع پر بھی مشیر کہ بھی بے خبر رکھتے۔ معاملات کی جتنی صفائی علوی صاحب مرحوم کے یہاں دیکھی، اس کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ راقم جب اپنا گھر تعمیر کرارہا تھا تو مرحوم نے ایک مرتبہ از خود میری پریشانی کو محسوس کرلیا۔ شام کو گھر پر تشریف لائے تو پچاس ہزار روپیہ کا چیک میرے حوالے کرکے مجھ سے یہ اصرار کیا کہ اپنی ضروریات پوری کروں۔ میں نے اسے لینے میں کچھ تامل اور ادائیگی کی مدت کا تعین کرنا چاہا تو انھوں نے اسے میری سہولت پر موقوف کردیا۔ الحمدللہ وہ ادائیگی چند ماہ کے

بعد کرنے کا وقت آیا تو میں نے انھیں نقد دینا چاہا لیکن مرحوم نے نقد لینے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ''میں نے چیک کے ذریعہ دیا تھا تو ادائیگی بھی چیک کے ذریعہ ہونی چاہیے تا کہ کل کو آپ پر کوئی بات نہ آسکے'' مرحوم کی خواہش کے مطابق چیک کے ذریعہ ادائیگی کر دی گئی۔ کچھ دنوں بعد پھر اسی قسم کی ضرورت پیش آئی جسے مرحوم نے بہ رضا و رغبت دے دیا۔ اس کی ادائیگی سے قبل مرحوم مختلف عوارضات کا شکار ہو گئے تو ایک دن مجھے بلا کر نصیحت کی کہ اگر میری زندگی میں ادائیگی نہ ہونے پائے تو یہ رقم بیگم کو دے دینا۔ اللہ کا شکر ہے کہ فوری انتظام ہو گیا اور میں نے ایک دو دن بعد مرحوم کے حوالے چیک کر دیا تو بہت زیادہ دعائیں دیں۔

مرحوم کا ایک اور وصف ہر حالت میں شکر خدا ادا کرنا تھا، بیماری کے ایام میں جب وہ کانپور چلے گئے تو اکثر و بیشتر فون پر رابطہ ہوتا۔ کبھی ان کے منہ سے اُف بھی نہ نکلا، یعنی اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد بتاتے کہ آج ڈاکٹروں کی رائے یہ رہی آج ڈکٹروں نے یہ تشخیص کیا۔ کبھی شکوہ شکایت نہ کرتے بلکہ مستقلاً طبیعت کی بہتری کو بتاتے۔ کچھ دنوں مرحوم سے بالکل رابطہ نہیں ہوسکا تو تشویش ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن جب طبیعت بحال ہوئی تو ایک دن مرحوم کا فون آیا۔ فرمانے لگے کہ ''موت کے منہ سے نکل کر آیا ہوں۔ کینسر کی تشخیص ہوئی تھی۔ الحمد للہ اب تندرست و توانا ہوں۔ علی گڑھ آچکا ہوں۔ نظامی ولا میں مقیم ہوں۔'' یہ حالات سن کر ملنے کا اشتیاق ہوا تو اگلے دن نظامی ولا گیا بہت تپاک سے ملے۔ حالات دریافت کیے۔ اپنی روداد سنائی اور پھر کچھ کرنے کے عزم کا اظہار کیا لیکن رفتہ رفتہ مرض پھر عود کر آیا، جو مرض الموت ثابت ہوا، ٹیلی فونک رابطے منقطع ہو گئے، بہت سے تکلّفات کے درمیان میں آنے کے سبب شدید خواہش کے باوجود بالمشافہ ملاقات کی کوئی شکل نظر نہیں آئی۔ ان کی بیماری، ضعف اور مرض کے اضافہ کے سلسلے میں اطلاعات ملتی رہیں بالآخر.....اپریل ۲۰۱۵ء کی شام کو ان کے پڑوسی برادر عزیز فوزان عتیق صاحب کے فون نے یہ خبر دے کر دل و دماغ میں ہلچل مچادی کہ علوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ فوری طور پر نظامی وِلا کا رُخ کیا۔ اپنے مشفق و محسن کا دیدار کیا۔ مرحوم کے چہرے پر جتنا سکون اس دن نظر آیا ایسا تو اس سے قبل کبھی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس موقع پر انا للہ وانا الیہ راجعون اور دعائے مغفرت کے علاوہ کچھ بھی ہدیہ پیش نہیں کیا جاسکتا تھا، سو کیا گیا۔ اگلے دن صبح ۱۰ر بجے منٹوئی کے احاطے میں مرحوم کی نماز جنازہ و تدفین عمل میں آئی جو نہ جانے کتنے بڑوں بڑوں کو دامن میں پناہ دینے کے باوجود ''ھل من مزید'' کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہے۔

"منها خلقنٰكم و فيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارةً اخرىٰ" کے ورد کے ساتھ تین مشت خاک کے ڈالنے کے بعد دل کو یہ اطمینان ضرور نصیب ہوا کہ مرحوم بھلے ہی اس فانی دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے ہوں لیکن جس قسم کی مخلصانہ زندگی گذار کر دنیا سے گئے ہیں اس سے توقع کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ العزیز وہ اب بہت زیادہ آسائش و آرام کی جگہ پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں وسیئات سے چشم پوشی اور حسنات کو قبولیت سے نواز کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

قضیۂ فلسطین

رہے خموش تو ظالم کی پیروی ہوگی!

محمد سراج الہدی ندوی ازہری
استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

اسرائیل ظلم و بربریت کا جو ننگا ناچ رہا ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں، یہ سب ایک ایسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے، جو ایک زمانہ پہلے طشت از بام ہو چکی ہے، یورپ، امریکہ اور اقوام متحدہ نے صیہونیت کے اس سانپ کو دودھ پلا پلا کر مشرق وسطی کو ڈسنے کے لیے تیار کیا ہے، اس سازش کا اصل مقصد پڑوسی مسلم ممالک کو اتنا کمزور کر دینا ہے، کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہ رہے اور یہ ممالک امریکہ و یورپ کے اشاروں پر ہی ناچتے رہیں اور انہی کے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے کا کام کرتے رہیں۔

فلسطین کا مسئلہ عالمِ اسلام کا ایک رستا ہوا ناسور ہے، ظلم و بربریت کی یہ داستان کوئی نئی نہیں ہے، تقریباً ایک صدی سے یہ کہانی جاری ہے، نومبر ۱۹۱۷ء میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی شکست کے بعد برطانیہ کے خارجہ امور کے سکریٹری بالفور (Mr. Bolfore) نے حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک اعلان کیا، جو ''اعلان بالفور'' کہلاتا ہے، جو مسٹر روتھس چائلڈ (Roths Chied) کے نام ایک خط کے ذریعہ منظر عام پر آیا، اس اعلان کے مطابق صیہونی لیڈروں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کو ایک علیحدہ وطن دیا جائے گا، کونسل آف لیگ نیشنز (اس وقت کی اقوام متحدہ) نے ۲۲ جولائی ۱۹۲۰ء کو فلسطین پر قانونی حکومت کا اختیار برطانیہ کو دے دیا، اسی اختیار کے ساتھ ہی یہودیوں نے دنیا کے مختلف گوشوں سے فلسطین کی طرف نقل مکانی شروع کر دی، ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے یہودیوں کی اس نقل مکانی کو محدود کرنا چاہا؛ مگر اس سلسلہ میں اسے صیہونیوں کی دہشت گرد تنظیموں اور امریکہ کی طرف سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے اقوام متحدہ میں فلسطین کی مستقل حکومت کا سوال اٹھایا، اور ۲۹ مئی ۱۹۴۷ء میں جنرل اسمبلی میں تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی گئی، ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے مکمل طور پر فلسطین سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسی تاریخ کو اسرائیلی ریاست کا بھی اعلان کر دیا گیا، اس وقت سے آج تک اسرائیل اپنی توسیع پسندانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے، سرزمین فلسطین پر دھیرے دھیرے غاصبانہ قبضہ کرتا جا رہا ہے،

وہاں کے باشندوں پر ان کی زمین تنگ کی جارہی ہے، ایک دن بھی انہیں چین وسکون کی زندگی نصیب نہیں ہورہی ہے، تف ہے مسلم ممالک پر، ان میں سے اکثر روز اول ہی سے تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

اسرائیل کی جانب سے توسیع مملکت کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے فلسطینی نہتے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، بچے، بوڑھے، عورتیں، جوان سبھوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے، جھوٹے جھوٹے الزامات لگا کران پر بمباری کی جاتی ہے، میزائیل داغے جاتے ہیں، ان کی آبادیوں پر بلڈوزر چلادیے جاتے ہیں، اپنے حقوق کے مطالبہ کرنے والوں کو دہشت گرد اور جنگجو کہا جاتا ہے، انہیں گرفتار کرکے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑایا جاتا ہے، اذیتیں دی جاتی ہیں، ایسی ایسی حرکتیں کی جاتی ہیں جن کے بیان سے انسانیت شرمسار ہوجائے۔

ابھی رمضان کے اس مبارک مہینہ میں اسرائیلی درندگی کی نئی مہم کا آغاز ۱۲ جون کو ہوا، جب تین یہودی بچے جن کی عمر ۱۶ تا ۱۹ سال تھی، وہ غربِ اردن کے یہودی علاقے سے اغوا کرلیے گئے، ان بچوں کے اغوا ہونے کی فلسطین نے بھی مذمت کی اور فلسطینی اتھارٹی نے ان بچوں کی بازیابی کے لیے اپنے طور پر ایک مہم کا بھی آغاز کیا تھا؛ مگر اسرائیلی وزیراعظم نتن یاہو نے ان بچوں کے اغوا کا الزام فوراً ہی حماس پر لگادیا اور ۲۴ گھنٹے کے اندر حماس کے کئی سو کارکنوں کو گرفتار کرکے اسرائیلی جیلوں میں پہنچادیا، جہاں ان پر بہیمانہ تشدد کیا گیا، حالاں کہ حماس نے یہودی نوجوانوں کے اغوا کے واقعہ سے مکمل طور پر لاتعلقی کا اظہار کیا، اس کے ترجمان نے یہ بھی کہا کہ حماس اپنی ہر کارروائی کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور یہ کارروائی ہم نے نہیں کی ہے؛ لیکن اسرائیل کہاں ماننے کو، وہ اس واقعہ کو زبردستی حماس کے سر تھوپ کر فلسطین پر زوردار بمباری کررہا ہے اور میزائیلیں داغ رہا ہے؛ حالاں کہ ۳۰ جون کو ان تینوں مغوی یہودی لڑکوں کی لاشیں مغربی کنارے کے ایک خالی پلاٹ سے مل گئیں، یہ سب ڈرامہ اسرائیل ہی کا تیار کیا ہوا ہے، خود قاتل ہوکر مقتول کا ہمدرد ورشہ بنا پھر رہا ہے۔ اس نے پورے غزہ کو لہولہان کردیا، ایک سولہ سالہ فلسطینی بچہ محمد ابو خضیر کو اغوا کرکے زندہ جلادیا گیا۔

ہمیں اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ اسرائیل فلسطینیوں کو نیست ونابود کرنے، دیگر مسلم ممالک پر قابض ہونے اور انہیں غلام بنانے کے منصوبے پر پوری طرح عمل پیرا ہے، اسرائیل مشرق وسطیٰ کے پورے مسلم علاقوں کو اور اس پورے حصہ کو اپنی میراث سمجھتا ہے، جس کا اظہار اسرائیلی پارلیمنٹ کی پیشانی پر لکھا ہوا یہ جملہ کرتا ہے: ''اے اسرائیل! تیری سرحد نیل سے فرات تک ہے''۔

یادرکھنے کی بات ہے کہ اسرائیلی حکومت یورپ وامریکہ کی ناجائز اولاد ہے، جسے مسلمانوں کے خلاف تیار کیا گیا ہے؛ لیکن یہ ایسی قوم ہے جو کبھی بھی کسی کی ہوئی ہے اور نہ ہوگی، اس کی اصل دشمنی تو اسلام اور مسلمانوں سے ہے؛ لیکن حقیقتاً بلا تفریق مذہب وملت وہ سارے انسانوں کو اپنا غلام سمجھتی ہے، اپنے مفاد کی خاطر کسی سطح تک بھی وہ آسکتی ہے، یہ وہ قوم ہے جس نے اپنے معصوم انبیاء تک کو شہید کرڈالا، ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور ان کے ساتھ ایسی نازیبا حرکتیں

کیں جن کو بیان کرنے کی قلم میں بھی طاقت نہیں، لکھنے سے پہلے ہی اس کی روشنائی خشک ہوا چاہتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ان پر بہت سارے عذاب بھیجے۔ بے وفائی، دھوکا دہی، غداری، عہد شکنی ان کی سرشت میں داخل ہے، انہی کرتوتوں کی وجہ سے ہٹلر نے گیس کے چیمبر میں ڈال کر دس لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس نے اپنے سب سے بڑے آقا امریکی صدر کو بھی نہیں چھوڑا، ۱۹۶۰ء کے بعد جب امریکہ سے اسرائیل کے تعلقات کچھ خراب ہونے لگے تھے اور امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے اسرائیل سے جوہری پروگرام کی تفصیل بتانے کا مطالبہ کیا تھا، تو اسرائیل نے جوہری اسلحوں کی تیاری کے سلسلے میں اس قدر بے لگام اور مغرور ہونے کا ثبوت پیش کیا کہ اس نے اپنے سب سے بڑے معاون اور سرپرست امریکہ کے صدر کینیڈی ہی کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ قتل کروادیا، اس کے بعد سے آج تک کسی امریکی صدر نے جوہری اسلحہ کے سلسلہ میں کسی طرح کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا (تفصیل کے لیے دیکھیے: ایک اسرائیلی مصنف کی کتاب ''اسرائیل اینڈ دی بم'')۔

اے لوگو! ہمیں ہوش میں آنا چاہیے، اسرائیل ظالم ہے، ہاں! یقیناً ظالم ہے، وہ تو ساری انسانیت کے لیے زہریلا سانپ ہے اور سانپ جب ڈسنے پر آتا ہے تو سپیرے کو بھی ڈس لیتا ہے، اسے بھی نہیں چھوڑتا۔ افسوس ہے اقوام متحدہ پر جو بڑی طاقتوں کی کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، وہ انسانیت کا ڈھونڈرا پیٹتا ہے، کیا اسے خاک وخون میں تڑپتی ہوئی فلسطینی لاشیں نہیں دکھائی پڑرہی ہیں۔ اس سے زیادہ افسوس تو مسلم ممالک پر ہے، جن کی زبانیں گنگ ہوچکی ہیں، ان کے منہ پر ایسے تالے پڑے ہوئے ہیں جن کی چابیاں مغربی آقاؤں کے پاس ہیں۔ آج اگر یہ چپ ہیں تو کل ان کی بھی خیر نہیں ہے، ان کو بھی لقمہ بنایا جائے گا، اس وقت کوئی بھی حلیف ملک ساتھ دینے والا نہیں ہوگا۔ منھ کھولو، ظلم کے خلاف آواز لگاؤ، بات نہ بنے تو سفارتی تعلقات ختم کرو، ڈھکے چھپے، کھلم کھلا ہر طرح سے فلسطینیوں کا ساتھ دو، اسرائیل کو ظلم سے باز آجانے کو کہو، کیا تمہارا ضمیر مردہ ہوچکا ہے، انسانیت کی قدر و قیمت کھوچکے ہو، کیا ان ننھے منے بچوں کی لاشوں کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں اشکبار نہیں ہوتیں، بے سہارا و بے سروسامانی کی حالت میں کیمپوں میں پڑے ہوئے لوگوں کے مصائب تمہیں نہیں رلاتے، ہم اپنے آرام دہ گھروں میں آرام سے کھا پی رہے ہیں، وہ بے چارے کھلے آسمان کی چھت کے نیچے بھوکے پیاسے اپنے حقوق کی بازیافت اور اللہ کے کلمہ کی بلندی میں لگے ہوئے ہیں، کیا ان معصوم بچوں، بے گناہوں اور مظلوموں کی خون میں لت پت تصویروں کو دیکھنے کے بعد بھی تمہیں آرام کی نیند آجاتی ہے، خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو، کچھ تو کرو، ظلم کے خلاف آواز تو لگاؤ، آخر یہ تماشا کب تک ہوتا رہے گا، تم سے اچھا تو وینزویلا کا صدر نکلا جس نے کم از کم اتنا تو کیا کہ بجا طور پر اسرائیل کو ایک ''ناجائز مملکت'' اور فلسطینیوں کو ایک ''بہادر قوم'' سے تعبیر کیا۔ اے لوگو سنو! بہت غور سے سنو!

جفا وظلم وستم دیکھ کے اگر لوگو!
رہے خموش تو ظالم کی پیروی ہوگی

☆☆☆

آخری صفحہ

یہ بیرسٹر مسلمان ہیں یا منافق؟

م-ق-ن

نواب مولوی محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کالج کو یونیورسٹی کی منظوری کے لئے ''لارڈ کرزن'' وائے سرائے کے محل میں گئے، ساتھ میں دو بیرسٹر (وکیل) لے گئے۔ مغرب (کی نماز) کا وقت ہوگیا تنہا وائے سرائے لاج میں نواب صاحب نے نماز پڑھی۔ ان بیرسٹروں نے وائسرائے سے کہا:

''حضور! یہ مولوی صاحب دقیانوسی آدمی ہیں، آدابِ شاہی سے واقف نہیں، ہم لوگ بہت شرمندہ ہیں اور معافی کے خواستگار ہیں کہ انہوں نے یہاں نماز شروع کردی''۔

وائسرائے سگریٹ پیتا رہا اور خاموش رہا۔ جب محسن الملک صاحب نماز پڑھ کر آئے تو وائسرائے ''لارڈ کرزن'' کھڑا ہوگیا اور مولوی صاحب کو کرسی پر بٹھا کر خود بیٹھا اور کہا: کہ ''مولوی صاحب! آپ سے دل بہت خوش ہوا، وائسرائے لاج کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خدا کا نام لیا گیا۔ یہ بیرسٹر مسلمان ہیں یا منافق؟ اگر آپ کی خاطر ملحوظ نہ ہوتی تو ان کو کان پکڑ کر نکال دیتا، جو خدا نے کی عبادت سے معافی طلب کررہے ہیں، ہم کو خوش کرنے کے لئے''

قارئین باتمکین غور فرمائیں! کہ وائسرائے کے یہ تأثرات اور جذبات کہ نماز پر اظہار خوشی، اور بیرسٹر کے ترکِ صلاۃ (نماز چھوڑنے) پر منافقت کا اندیشہ اور غصہ سے بپھر کر ان کو لاج سے کان پکڑ کر باہر نکالنے پر آمادگی۔ لیکن تحمل و برداشت صرف نمازی مولوی کی وجہ سے، اور ان کے طفیل و برکت سے۔ لارڈ کرزن وائسرائے کا یہ جملہ ''خدا کی عبادت سے معافی طلب کررہے ہیں ہم کو خوش کرنے کے لئے'' بڑا سخت تازیانہ ہے، ایمانی حس اگر ہے تو نمازی بنانے اور بارگاہِ خداوندی میں جبین نیاز خم کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

مذکورہ واقعہ میں ہم تمام مسلمانوں کے لئے عبرت و نصیحت ہے کہ ایک انگریز جنرل گورنر کے نزدیک نماز کی اور نمازی کی اس قدر قدر دانی اور اہمیت کہ وہ ایک نمازی کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور جب تک وہ بیٹھ نہیں گئے خود کرسی پر نہیں بیٹھے، اور مسلمان وکیل کی دینی بے حسی اور بے غیرتی دیکھئے کہ نماز ادا کرنے والے مسلمانوں کو دقیانوسی آدمی کہہ کر پکار رہا ہے؟

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، کاش دلِ حساس اس واقعہ سے عبرت لے اور چشم بینا کو رِ بینا کو دونوں کی زندگی کا فرق دکھا سکے۔ آج مسلمانوں میں اس حوصلے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ زمانہ اور ماحول سے متأثر ہوئے بغیر شعائرِ دین کی اہمیت اور عظمت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر عمل کرے کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے کسی دینی حکم اور سچائی پاکبازی کو چھوڑ دینا ابوطالب کا شیوہ ہے، اور ساری ملامتوں کے جھرمٹ میں خدا کے احکام کو ادا کرنا اور حق کے سامنے گردن ڈال دینا صحابۂ کرامؓ کا اسوہ اور طریقہ ہے۔ حضرات صحابہ کا اسوہ ہمارے لئے سو فیصد قابل تقلید ہے لیکن ابوطالب کا شیوہ کسی طرح نشانِ راہ اور نشانِ منزل نہیں۔

☆☆☆

آخری صفحہ

اب تو ''اشراف'' کی کیفیت باقی نہیں رہی

م-ق-ن